

International Research Journal on Islamic Studies (IRJIS)
ISSN 2664-4959 (Print)
Journal Home Page: https://www.islamicjournals.com/
E-mail: tirjis@gmail.com / info@islamicjournals.com
Published by: "Al-Riaz Quranic Research Centre" Bahawalpur

قرآن مجید میں دعویٰ تضاد کا علمی محاسبہ

1. **Dr. Habib Ullah Chisti**
   Associate Professor
   Head of the Department of Islamic Studies
   Islamabad Model Postgraduate College H8, Islamabad
   Email: habibullahchishti@gmail.com

To cite this article:

Dr. Habib Ullah, Chisti "قرآن مجید میں دعویٰ تضاد کا علمی محاسبہ" International Research Journal on Islamic Studies Vol. No. 1, Issue No. 2 (January 1, 2020) Pages (1–31)

Journal	International Research Journal on Islamic Studies Vol. No. 1, Issue No. 2 || January - July 2020 || P. 1-31
Publisher	Al-Riaz Quranic Research Centre, Bahawalpur
URL:	https://www.islamicjournals.com/?p=275&preview=true
Journal homepage	www.islamicjournals.com
Published online:	01 January 2020

قرآن مجید میں دعویٰ تضاد کا علمی محاسبہ

By
Dr. Habib Ullah Chisti

ABSTRACT:

One of the main arguments that Allah has made in the Quran about the authenticity of this last book is that the Quran is free from all kinds of contradictions and differences. Whoever interprets the Quran, the authenticity of the Quran has become clearer on it. Different forms of language and literature are adopted in the Quran. If one is not familiar with the Quranic verses or does not have access to the truth of the words or is unfamiliar with the reality of the ayah, it may be possible to feel the contradiction in some places, when in reality it is not.

Keywords: Quran, Argument, Authenticity, Contradiction, Reality

قرآن مجید میں دعویٰ تضاد کا علمی محاسبہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس آخری کتاب کی صداقت و حقانیت پر جو دلائل دیے، ان میں سے ایک اہم دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید ہر قسم کے تضاد اور اختلاف سے پاک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا [1]

تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔

جو بھی قرآن مجید میں تفکر و تدبر کرے گا تو قرآن مجید کے اس دعویٰ کی صداقت اس پر واضح سے واضح تر ہوتی چلی گئی۔ قرآن مجید کا تناقض اور اختلاف سے پاک ہونا ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس کا انکار کوئی بھی انصاف پسند آدمی نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں زبان و ادب کے مختلف اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی قرآنی اسالیب کی ان نزاکتوں سے واقف نہ ہو یا الفاظ کی حقیقت تک رسائی نہ رکھتا ہو یا نسخ کی حقیقت سے ناآشنا ہو تو ممکن ہے وہ بعض مقامات میں تضاد کی کیفیت محسوس کرے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوگا۔

قرآن مجید کے طلباء کے لیے یہ کوئی اجنبی بات نہیں ہے۔ اس حقیقت کو مفسرین کرام نے خوب واضح کر دیا ہے اور اس فن پر مشتمل کتابیں بھی موجود ہیں کہ قرآن مجید ہر قسم کے تضاد اور تناقض سے محفوظ ہے۔ بات کی حقیقت کو نہ سمجھنے سے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن عام قاری ایسی چیزوں سے کوئی غلط مفہوم اخذ کر سکتا ہے یا ایک اضطراب میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ زیر نظر تحریر کا مقصد ایسے ہی شبہات کا ازالہ ہے تاکہ قرآن مجید کی صداقت و حقانیت پر کوئی کسی بدگمانی میں مبتلا نہ ہو۔ اس مضمون میں اس آرٹیکل کے مندرجات کا ذکر بھی ہوگا اور اس تناظر میں چند دیگر چیزیں بھی ذکر کی جائیں گی تاکہ اس مسئلہ کے تمام بنیادی پہلو بیان کر دیے جائیں۔اقول و باللّٰه التوفيق عليه توكلت و اليه انيب

1. حضرت مریم علیہا السلام سے کتنے فرشتوں نے کلام کیا؟

حضرت مریم علیہا السلام سے فرشتوں کے کلام کے حوالے سے ان کی تعداد پر سوال اٹھایا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب قرآن مجید سے ہی ملتا ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہے:

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰۗىِٕكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ [2]

جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا [3]

ہم نے ان کے پاس اپنی روح (جبریل امین) کو بھیجا جو ان کے سامنے ایک مکمل انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو بشارت صرف جبریل امین نے دی تھی اور مابعد آیات بھی اسی کی مؤید ہیں کہ بشارت ایک فرشتے نے ہی دی اور جبریل امین نے کہا:

---

[1] (النساء:۸۲)

[2] (آل عمران:۴۵)

[3] (مریم:۱۷)

اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا [4]

میں تمہارے ربّ کا (بھیجا ہوا) قاصد ہوں اور (اس لیے آیا ہوں) تاکہ میں تمہیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔

یہاں اَ ھَبَ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ بشارت ایک فرشتے نے دی اور یہاں جبریل کی طرف بیٹا دینے کی نسبت مجازی ہے کیونکہ وہ اس کا سبب بن رہے تھے ورنہ بیٹے اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔

ان دونوں آیات میں بظاہر تضاد محسوس ہوتا ہے کہ سورۃ آل عمران میں کہاں فرشتوں نے بشارت دی اور سورۃ مریم میں فرمایا کہ ایک فرشتے نے بشارت دی۔ حقیقت میں یہاں کوئی تضاد نہیں یہ صرف زبان کا ایک اسلوب ہے۔ سورہ مریم سے واضح ہے کہ بشارت صرف جبریل امین علیہم السلام نے دی تھی چونکہ وہ فرشتوں کے سردار ہیں تو ان کی بات گویا سب کی بات تھی جیسے امام کی قرآت سب مقتدیوں کی قرآت ہوتی ہے۔ یہاں الملائکہ کے متعلق علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

والمراد من الملائكة رئيسهم جبريل [5]

کہ یہاں الملائکہ سے مراد ان کے سردار جبریل ہیں۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

المراد بالملائكة ههنا جبريل وحده [6]

یہ ملائکہ سے مراد صرف جبریل ہیں۔

ممکن ہے جبریل امین اور فرشتوں کی معیت میں آئے ہوں تو سب کا اعتبار کرتے ہوئے جمع کا صیغہ بول دیا اور رئیس و متکلم کا اعتبار کرتے ہوئے واحد کا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک انسان کسی عالم سے کوئی مسئلہ پوچھے اور پھر کہے کہ اس مسئلہ میں علماء یہ کہتے ہیں۔ بہر صورت یہ زبان کا اسلوب ہے تضاد نہیں۔

2. قوم ثمود کیسے تباہ ہوئی؟

قوم ثمود کی تباہی کے سبب کو بیان کرتے ہوئے ایک مقام پر فرمایا:

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ [7]

تو انہیں ایک زلزلے نے پکڑ لیا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ [8]

تو جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، انہیں ایک چنگھاڑ نے پکڑ لیا تو وہ اپنے گھروں میں اس طرح اوندھے پڑے رہ گئے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ [9]

---

[4] (مریم:۱۹)

[5] ابوالفضل، محمود آلوسی، روح المعانی، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ج۳، ص ۱۵۴

[6] امام فخر الدین رازی، التفسیر الکبیر، مکتب الاعلام الاسلامیۃ، ج۸، ص ۴۴

[7] (الاعراف:۷۸)

[8] (ھود:۱۱)

[9] (الحاقۃ:۵)

رہے ثمود تو وہ حد سے بڑھی ہوئی چیز سے ہلاک کر دیے گئے۔

فَاَخَذَتۡهُمۡ صٰعِقَةُ الۡعَذَابِ الۡهُوۡنِ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ [10]

تو انہیں ان کے کرتوتوں کے سبب سراپا ذلت کڑک نے آن پکڑا۔

ان آیات میں بظاہر تضاد محسوس ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں ہلاکت کا سبب زلزلہ، دوسری میں چنگھاڑ، تیسری میں الطاغیۃ اور چوتھی میں صَاعِقَۃ کو قرار دیا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی تضاد نہیں بلکہ یہاں ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔ ان کی ہلاکت اس طرح ہوئی کہ جبریل امین ؑ نے ایک چیخ ماری جس سے ان کے دل سینوں میں پھٹ گئے اور مر گئے۔ جب سخت آواز آئے تو اس سے زمین میں تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے یعنی الصیحۃ، الرجفۃ کا سبب تھی۔ الرجفۃ ان کی ہلاکت کا سبب قریب اور الصَّیحۃ سبب بعید تھا تو ان کی ہلاکت کا ذکر کبھی سبب قریب سے کیا گیا اور کبھی سبب بعید سے اور ایک قول یہ بھی کہ ان پر اوپر سے چیخ کا عذاب آیا اور نیچے سے زلزلے کا:

الزلزلة الشديدة من الارض و الصيحة من السماء [11]

زمین سے شدید زلزلہ آیا اور آسمان سے چنگھاڑ کی آواز آئی۔

لأن عذابهم كان بهما معا [12]

کیونکہ ان پر بیک وقت دونوں طرح سے عذاب آیا۔

اس لیے الصیحۃ اور الرجفۃ میں کوئی تضاد نہیں۔ عذاب کا تیسرا سبب الطاغیۃ بیان کیا گیا۔ الطاغیۃ حد سے بڑی ہوئی چیز کو کہا جاتا ہے چونکہ یہ عذاب بہت سخت اور حد سے بڑھا ہوا تھا اس لیے اسے الطاغیۃ سے تعبیر کیا گیا اور ان کی تباہی کا سبب الصاعقہ بھی قرار دیا گیا۔ یہ بھی دراصل اسے عذاب کی تعبیر ہے: فان الصاعقه هی الصوت الشديد من الجوّ [13] کیونکہ الصاعقۃ دراصل فضا سے آنے والی سخت آواز کو کہا جاتا ہے۔ تو دراصل ان چیزوں میں تضاد نہیں ہے۔ یہ ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔ جیسے اگر کسی کے بیٹے کا نام ڈاکٹر قاری محمد اسلم ہو تو وہ کبھی اسے بیٹا کہہ کر پکارے، کبھی ڈاکٹر صاحب، کبھی قاری صاحب اور کبھی اسلم کہہ کر پکارے تو یہ تضاد نہیں ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔

3. زمین کی تخلیق پہلے ہوئی یا آسمان کی؟

زمین و آسمان کی تخلیق سے متعلق ایک مقام پر فرمایا:

هُوَ الَّذِيۡ خَلَقَ لَـكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰٮهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ [14]

وہ وہی تو ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے تمہارے فائدے کے لیے پیدا کیا۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں سات آسمان بنا دیا۔

اس آیہ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ زمین پہلے بنی اور آسمان بعد میں جبکہ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰٮهَا [15]

اور اس نے زمین کو اس کے بعد بچھایا۔

---

[10] (حٰم السجدۃ:۱۷)

[11] امام جلال الدین السیوطی، تفسیر جلالین، کراچی، قاسم پبلی کیشنز، ج ا، ص ۲۷۱

[12] علامہ احمد بن محمد الصاوی، تفسیر صاوی، کراچی، قاسم پبلی کیشنز، ج ا، ص ۲۷۱

[13] امام راغب الاصفہانی مفردات الفاظ القرآن، مادہ صعق، دار الکاتب العربی، ص ۲۸٦

[14] (البقرہ:۲۹)

[15] (النازعات:۳۰)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے زمین کی تخلیق آسمان کے بعد ہوئی جبکہ قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی۔ زمین فرش کی طرح اور آسمان چھت کی طرح ہے تو فرش پہلے بنتا ہے اور چھت بعد میں۔ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ نوعیت کا بیان ہے۔ دَحْو سے مراد زمین کی تخلیق نہیں ہے بلکہ اسے بچھانا ہے یعنی زمین کا مادہ پہلے پیدا کیا اور اسے موجودہ حالت میں بچھایا آسمان کی تخلیق کے بعد۔ علامہ زمحشری لکھتے ہیں:

لأجرم الارض تقدم خلقه خلق السماء و اما دحوها فمتاخر [16]

زمین کے مادے کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی اور اس کا پھیلاؤ اس کے بعد ہوا۔

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

قیل ان الدحی کان بعد خلق السموات و الارض رواه علی ابن ابی طلحة عن ابن عباس [17]

اور ایک قول یہ ہے کہ زمین کو پھیلایا آسمان کے بعد گیا۔ اسے علی ابن ابی طلحہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔

یعنی زمین بنی آسمان سے پہلے ہے اور اسے پھیلایا آسمان کے بعد گیا ہے۔ حضرت ابن عباس اس تناظر میں فرماتے ہیں:

خلق اللّٰہ الارض بأقواتها من غیر ان یدحوها قبل السماء [18]

کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس کی خوراکوں کے ساتھ بغیر پھیلائے آسمان سے پہلے پیدا کیا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی لیکن اسے پھیلایا آسمان کے بعد گیا۔ اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ علّامہ عزالدین عبدالسلام کی رائے یہ ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہی ہوئی لیکن ان میں اونچ نیچ بہت تھی:

فازال التفسر لیس بعد بناء السماء و اما خلقها فکان قبل خلق السماء[19]

تو اس کی اونچ نیچ آسمان کی تخلیق کے بعد درست ہوئی اور زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہی ہوئی۔

اور اس کا ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے: والارض ذلک دحها میں بعد مَعْ کے معنی میں ہے جیسے ایک مقام پر ایک سرکش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ [20]

اور اس کے ساتھ وہ بداصل بھی ہے۔

یعنی اس میں پہلی بیان کردہ برائیاں بھی ہیں اور یہ بھی ہے۔ ایسے ہی پہلے اللہ تعالیٰ نے آسمان کی تخلیق کا ذکر کیا اور اس تناظر میں اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور پھر فرمایا: والارض بعد ذلک دحها۔ کہ اس کے ساتھ ساتھ ہم نے زمین کو پھیلانے کا بھی انعام کیا۔ اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہو جاتی ہے۔

4. روزے رکھنا ضروری ہے یا اختیاری؟

اس تناظر میں کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی دو آیات میں مختلف حکم بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ [21]

اور جو لوگ اس کی طاقت رکھیں (اور روزہ نہ رکھنا چاہیں) تو ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔

---

[16] ابوالقاسم محمود بن عمر الزمخشری، تفسیر الکشاف، کراچی، قدیمی کتب خانہ، ج ۱، ص ۱۵۳

[17] الامام اسماعیل بن کثیر الدمشقی، تفسیر القرآن العظیم، القاہرہ، دارالحدیث، ج ۱، ص ۶۵

[18] مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ، ج ۱، ص ۵۵

[19] علامہ عزالدین عبدالسلام، الفوائد فی مشکل القرآن، ص ۱۵۶

[20] (القلم: ۱۳)

[21] (البقرہ: ۱۸۴)

اور دوسرے کے مقام پر فرمایا:

فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ [22]

اور تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے وہ اس کے روزے ضرور رکھے۔

ان دونوں آیات میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں یہاں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ روزے داروں کی مختلف حیثیتوں کا ذکر ہے۔ ان آیات کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ رخصت والا حکم ابتدا میں تھا اور یہ بعد والی آیت سے منسوخ ہو گیا۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں یہ آیات نازل ہوئی: وعلی الذین یطیقونه تو ہم میں سے جو چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو چاہتا فدیہ ادا کر دیتا: حتی نزلت الآیة بعدها فنسختها فمن شهد منکم الشهر فلیصمه [23] یہاں تک کہ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی فمن شهد منکم کہ جو تم میں سے جو موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے تو اس آیت نے اسے منسوخ کر دیا۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

رخص لهم فی ذلک اول الامر لما امرو بالصوم فاشتد علیهم لانهم لم یتعد ثم نسخ [24]

جب انہیں روزوں کا حکم دیا گیا تو یہ ان پر بہت شاق گزرا کیونکہ وہ اس کے عادی نہیں تھے اس لیے شروع شروع میں فدیہ کی رخصت دی گئی۔ پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

نسخ کی صورت میں دونوں آیات میں تطبیق بلکل واضح ہے۔ ان آیات کی تطبیق میں ایک قول یہ ہے کہ یطیقونه باب افعال ہے اور اس کا ہمزہ کسی سلب ماخذ کے لیے آتا ہے جیسے اشکیته کا مطلب ہے میں نے اس کی شکایت کو دور کیا۔ تو ی طیقونه سے مراد یہ ہے کہ جو اس کی طاقت نہیں رکھتے وہ فدیہ ادا کریں اور باقی لوگ روزے رکھیں تو یہ حکم شیخ فانی کے لیے اور دوسرا حکم عام لوگوں کے لیے ہے۔ ایک قول کے مطابق یطیقونہ سے پہلے لا محذوف ہے لیکن اس صورت لا کو محذوف ماننے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ایک قول کے مطابق یُطَیِّقُوْنَہٗ، کے معنی میں ہے۔ اس کی ایک قراءت یہ بھی ہے۔ اس سے مراد ہے:

یکلفونه اَوْ یتکلفونه علی جهد منهم وعسروهم الشیوخ والعجائز و حکم هولاء الافطار و الفیدیة وهو علی هذا الوجه ثابت غیر منسوخ [25]

جو روزہ بہت تکلیف اور مشقت کے ساتھ رکھ سکتے ہیں اور وہ بوڑھے مرد اور عورتیں ہیں، ان کا حکم یہ ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور افطار کریں اور فدیہ ادا کریں۔ اس صورت میں یہ آیت منسوخ نہیں ہو گی۔

اس معاملہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی رائے یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق روزوں کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یہاں فدیۃ طعام مسکینسے مراد صدقہ فطر ہے مراد یہ ہے:

وعلی الذین یطیقون الطعام فدیة هی طعام مسکین [26]

جو لوگ کھانا کھلانے پر قادر ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا صدقہ فطر دیں۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

22(البقرہ:۱۸۵)

23امام جلال الدین، عبد الرحمن بن ابی بکر سیوطی، بیروت، دار الفکر، ج ا، ص ۴۳۱

[24]علامہ عمر بن محمد بیضاوی، تفسیر بیضاوی، بیروت، دار اصادر، ج ا، ص ۱۱۰

[25]الکشاف، ج ا، ص ۲۵۲

[26]شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، الفوز الکبیر، کراچی، سعید کمپنی، ص ۲۱

وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین میں فدیۃ طعام مسکین اگرچہ مؤخر ہے لیکن ترکیب میں بلحاظ مرتبہ مقدم ہے چونکہ یہ مبتدا مؤخر ہے تو یہاں اضمار قبل الذکر صرف لفظاً ہے جو کہ جائز ہے اور چونکہ فدیہ طعام کے معنی میں ہے اس لیے یطیقونہ کی ضمیر کے اس کی طرف لوٹنے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں کوئی تعارض نہیں بلکہ ان میں واضح تطبیق موجود ہے۔

5. زمین و آسمان کتنے دنوں میں بنے؟

اس سوال کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں اختلاف ہے۔ کہیں فرمایا گیا کہ زمین و آسمان چھ دنوں میں بنے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ [27]

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔

اور یہی بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی گئی بالخصوص درج ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۔ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا [28]

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ [29]

جبکہ ایک اور مقام پر فرمایا:

خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۔ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ [30]

اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں بنایا۔ اور اس نے زمین میں جمے ہوئے پہاڑ پیدا کیے جو اس کے اوپر ابھرے ہوئے ہیں اور اس میں برکت ڈال دی اور اس میں توازن سے غذائیں پیدا کیں۔ یہ سب کچھ چار دن میں ہوا۔ پھر اس نے دو دن میں سات آسمان بنائے۔

ان آیات سے یہ استدلال کرنا کہ زمین و آسمان آٹھ دنوں میں بنے، ایک بے دلیل بات ہے۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو دنوں میں زمین بنائی اور دو دنوں میں اس میں انسانی ضروریات کی چیزیں اور خوراک پیدا کی۔ یہ سب چیزیں چار دنوں میں ہوئیں پھر اس نے دو دنوں میں آسمان بنائے۔ تو یہ سب کچھ چھ دنوں میں ہی بنا اور دوسری آیات میں بھی یہی فرمایا گیا فی اربعۃ ایام سے مراد زمین اور اس کی ضروری اشیا کے ٹوٹل دن ہیں اور وہ چار ہیں جیسے کوئی کہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو چار سال کی عمر میں مکتب میں داخل کروایا اور چھ سال کی عمر میں سکول میں داخل کروایا تو یہاں چھ سال کی عمر ٹوٹل عمر ہے۔ ایسے ہی فی اربعة ایام زمین اور اس کی ضروری اشیاء پیدا کرنے کے کل دن ہیں۔ امام نسفیؒ فرماتے ہیں:

تقول سرت من البصره الی بغداد فی عشرة و الی الكوفة فی خمسة عشر ای فی تتمة فی خمسة عشر [31]

تو کہتا ہے کہ میں بصرہ سے بغداد دس دن میں پہنچا اور کوفہ تک پندرہ دن میں تو یہاں پندرہ دن سے مراد بغداد سے کوفہ تک کی مدت نہیں بلکہ بصرہ سے کوفہ تک کی مدت ہے۔

ایسے ہی فی اربعۃ ایام میں زمین اور اس کی ضروریات کی تخلیق کی کل مدت ہے اور پھر دو دن میں آسمان بنائے۔ یہ ٹوٹل چھ دن ہوئے اور یہی بات قرآن کریم میں دیگر مقامات پر صراحت سے کہی گئی ہے۔ اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام اس سے پاک ہے کہ اس میں تضاد ہو۔

---

[27](ہود:۷)

[28](الفرقان:۵۹)

[29](الحدید:۴)

[30](حم السجدہ:۹ تا ۱۲)

[31]الامام عبداللہ بن احمد نسفی، مدارک التنزیل، کراچی، قدیمی کتب خانہ، ج۳، ص۲۲۸

6. ٦۔ بدکاری کی سزا کیا ہوگی؟

قرآن مجید میں بدکاری کی سزا بیان کرتے ہوئے ایک مقام پر فرمایا:

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْھُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَھُنَّ سَبِيْلًا [32]

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنوں میں سے چار گواہ بنالو تو اگر وہ (بدکاری کی) گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں روک لو یہاں تک کہ ان کی موت آجائے یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے اور راستہ پیدا کر دے۔

اسی تناظر میں ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ [33]

بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ۔

ان دونوں آیات کی روشنی میں قرآن مجید میں تضاد کا دعویٰ کرنا فہم قرآن سے ناواقفیت کی دلیل ہے کیونکہ پہلی آیت بدکاری کی سزا کے تناظر میں ابتدائی اور پہلا حکم بیان کرتی ہے جس کی طرف اشارہ آیت کے الفاظ سے ہو رہا ہے کہ فرمایا: اویجعل اللہ لھن سبیلا کہ تم انہیں محبوس رکھنے کی سزا اس وقت تک دو جب تک اللہ تعالیٰ کوئی اور راہ نہ نکال دے۔ یہاں یہ واضح اشارہ پایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مسئلہ میں کوئی اور حکم نازل فرمائے گا۔ پھر سورۃ النّور میں وہ حکم نازل فرما دیا گیا کہ ان دونوں کی سزا سو سو درّے ہوگی۔ سورۃ النساء والی آیت کو سورۃ النور کی اس آیت نے منسوخ کر دیا۔ تو ان دونوں آیات میں تضاد نہیں ہے بلکہ پہلی آیت منسوخ اور دوسری ناسخ ہے۔

جب سورۃ النّور کی یہ آیت نازل ہوئی تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

خذوا عنى خذوا عنى قدجعل اللّٰه لهن سبيلا البكر بالبكر جلدمائة و تغريب عام والثيب و الثيب جلدمائة والرجم [34]

مجھ سے احکام لے لو، مجھ سے احکام لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے بدکاری کرنے والی عورتوں کا حکم بیان فرما دیا ہے۔ اگر غیر شادی شدہ (مرد و عورت) بدکاری کریں تو انہیں سو کوڑے مارو اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دو اور اگر شادی شدہ مرد و عورت بدکاری کریں تو انہیں سو کوڑے مارو اور سنگسار کر دو۔

تو پہلی آیت میں جس حکم کے نزول کا اشارہ تھا، دوسری آیت میں اس کا تذکرہ ہے۔ محبوس کرنے کی سزا دوسرا حکم نازل ہونے تک تھی۔ علّامہ مظہریؒ فرماتے ہیں:

اللّٰه سبحان أمر بالحبس الى ان ينزل الحد فيجرى عليه [35]

اللہ تعالیٰ نے قید کرنے کا حکم اس وقت تک دیا جب تک حد کا حکم نازل نہیں ہوا۔ حکم نازل ہونے کے بعد اسی کا نفاذ ہوگا۔

علامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں:

كان ذلك عقوبتهن فى اول الاسلام ثم نسخ بقوله الزانية والزانى [36]

محبوس کرنے کی سزا شروع اسلام میں تھی پھر سورہ النور والی آیت سے یہ حکم منسوخ ہو گئی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں نسخ ہے، کوئی تضاد نہیں ہے۔

---

[32] (النسائ:۱۵)

[33] (النّور:۲)

[34] سنن ابن ماجہ، باب من وقع على جارية، دارالرسالۃ العلمیہ، رقم الحدیث، ۲۵۵۵، ج۳، ص ۵۸۵

[35] تفسیر مظہری، ج۲، ص ۴۱

[36] الکشاف، ج۱، ص ۵۱۸

7. ۷۔بیوہ کی عدت کتنی ہے؟

اسلامی تعلیمات کے مطابق اگر بیوہ حاملہ بھی ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے ورنہ چار مہینے دس دن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔ 37

اور تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکیں گی۔

مقالہ کے شروع میں ہم نے قرآن کریم پر تضاد کا بہتان باندھنے والے جس مضمون کا ذکر کیا تھا، اس میں مضمون نگار کا خیال ہے کہ مذکورہ آیہ کریمہ کا اِس درج ذیل آیہ کریمہ کے ساتھ تضاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ 38

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنی بیویوں کے متعلق وصیت کر جائیں کہ وہ (شوہر کے گھر سے) نکالے بغیر ایک سال تک (نان ونفقہ کا) فائدہ اٹھائیں گی اور اگر وہ خود نکل جائیں تو وہ قاعدہ کے مطابق اپنے متعلق جو بھی فیصلہ کریں تم پر کچھ گناہ نہیں اور اللہ غلبے والا اور صاحب حکمت ہے۔

ان دونوں آیات کی روشنی میں قرآن مجید میں تضاد کا دعویٰ کرنا فہم قرآن سے محرومی ہے۔ ایک بہت سطحی اور بے حقیقت بات ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہے کہ پہلی آیت میں عدت چار مہینے دس دن اور دوسری میں ایک سال بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت میں عدت کا بیان اور دوسری میں وصیت کا۔ جب تک میراث کے احکام نازل ہوئے تھے اس وقت تک مرنے والے کو حکم تھا کہ وہ ممکنہ طور پر اپنے مال کے متعلق وصیت کر جائے۔ دوسری آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ قریب الموت خاوند کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر والوں کو وصیت کر جائے کہ وہ اس کی بیوی کو ایک سال تک گھر سے نہ نکالیں۔ وہ ایک سال سکنیٰ اور نفقہ سے فائدہ اٹھاتی رہے یعنی عدت تو چار مہینے دس دن ہی ہے البتہ وہ اپنے خاوند کی موت سے لے کر ایک سال تک سکنیٰ اور نفقہ کا فائدہ اٹھاتی رہے۔ البتہ اگر عدت گزارنے کے بعد خود نکلنا چاہے تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں۔ تو پہلی آیت میں عدت کا بیان ہے اور دوسری میں نفقہ اور سکنیٰ کے لیے وصیت کا۔ ان میں تضاد والی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں وصیت کا حکم تھا تو احکام میراث نازل ہونے کے بعد یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ علامہ ابن کثیر کہتے ہیں:

وكان للمتوفى منها زوجها نفقتها و سكنٰها فى الدارسنة فنسختها آية المواريث 39

جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کا سکنیٰ اور نفقہ ایک سال تک اس خاوند کے اہل خانہ پر لازم تھا۔ آیات میراث کے نزول سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

اگر بالفرض اس سے مراد عدت بھی لی جائے، تب بھی یہ آیت چار مہینے دس دن عدت والی آیت سے منسوخ ہو گی۔ چنانچہ یہاں ان آیات میں تضاد نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

8. ۸۔اخلاق نبوی اور جہاد

قرآن مجید میں ایک مقام پر حضور اکرم ﷺ کے اخلاق عالیہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ 40

اور یقیناً آپ بلند اخلاق پر فائز ہیں۔

اور ایک مقام پر ایک واقعہ کے تناظر میں فرمایا گیا:

---

37 (البقرہ:234)

38 (البقرہ:۲۴۰)

39 تفسیر القرآن العظیم، ج۱، ص ۲۸۰

40 (القلم:۴)

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۔اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی [41]

حضور ﷺ چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا، اس لیے کہ آپ کے پاس ایک نابینا آیا۔

ایک اور مقام پر جہاد کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

فَاِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡہُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ [42]

اور جب ان لوگوں سے تمہارا مقابلہ ہو جو کفر پر ڈٹ گئے تو ان کی گردنیں اڑادو۔ یہاں تک کہ جب ان کی خوب خونریزی کر چکو تو انہیں مضبوطی سے باندھو۔

ان آیات طیبات کے متعلق یہ کہا گیا کہ ان میں تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ کسی سے منہ پھیرنا اور خون ریزی کرنا اخلاق کے خلاف ہے۔ جبکہ یہ تینوں آیات اپنی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں بلکہ یہ ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں سمجھنا ہو گا کہ اخلاق کی حقیقت کیا ہے اور اس کا دائرہ کار کیا ہے تا کہ اخلاق کے متعدد مظاہر کی روشنی میں ان آیات میں تطبیق سمجھی جا سکے۔ اخلاق کی حقیقت بیان کرتے ہوئے امام رازیؒ فرماتے ہیں:

الخلق ملكة نفسانية يسهل على المتصف بها الاتيان بالافعال الجميلة [43]

خلق نفس کی اس صلاحیت کو کہا جاتا ہے کہ جس سے متصف ہونے والے شخص پر اچھے کام بجالانا آسان ہو جاتا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ خلق اس صلاحیت کا نام ہے جس کی وجہ سے انسان بغیر کسی تکلف اور تردد کے اچھے کام سر انجام دیتا ہے جیسے کان بغیر کسی تردد کے سنتے اور آنکھ بغیر کسی تردد کے دیکھتی ہے، اسی طرح وہ بغیر کسی تردد کے ہر اچھا کام سر انجام دیتا ہے۔

یہ حقیقت بھی ناقابل فراموش ہے کہ اچھے کام کی نوعیت ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی اور تمام بندوں کے معاملہ میں اچھا کام ہمیشہ ایک نوعیت کا نہیں ہوتا کچھ انسان دلیل کی بات سمجھتے ہیں، کچھ پیار کی اور کچھ سختی کی۔ ہر ایک سے اس کے مزاج کے مطابق معاملہ کرنا ہی اچھا کام کہلائے گا۔ جو بندہ سختی کی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان سمجھتا ہی نہیں، اس کے ساتھ نرم رویہ ہی رکھ کر اسے مزید بگاڑ دینا اچھا کام کہلائے گا اور نہ ہی اخلاق عالیہ بلکہ یہ اس کے ساتھ زیادتی اور ظلم ہو گا کہ اس پر سختی نہ کر کے اس کے مزید بگڑنے کے اسباب فراہم کیے جائیں۔ انسانوں کو معاف کرنا بہت اچھی چیز ہے لیکن اگر ایک انسان کسی بے گناہ کو قتل کر کے اس کے بچوں کو یتیم کرے اور اس کی بیوی کا سہاگ اجاڑ دے تو اخلاق کا تقاضا اسے معاف کرنا نہیں ہو گا بلکہ اخلاق کا تقاضا اسے سزا دینا ہو گا تا کہ آئندہ کوئی کسی کو قتل کر کے اس کے بچوں کو یتیم نہ کرے کیونکہ قانون الٰہی میں قصاص میں زندگی ہے۔ مجرم کو سزا دیتے وقت جس کے ہاتھ کانپ جائیں وہ رحم دل نہیں بزدل ہوتا ہے۔ مجرم کو سزا دینا اخلاق کے منافی نہیں بلکہ عین اخلاق کا تقاضا ہو گا اور اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسا نرم رویہ رکھنا کہ وہ بگڑتے چلے جائیں، اخلاق نہیں کہلائے گا بلکہ اخلاق کا تقاضا یہ ہو گا کہ نرمی کے موقع پر نرمی اور سختی کے موقع پر سختی کی جائے۔

اس اصولی بک8ات کو سمجھ لینے کے بعد بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ان تینوں آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ نہ تو حضور اکرم ﷺ کا ناراض ہونا اور روئے زیبا پھیرے نا اخلاق کے منافی ہے اور نہ ہی کافروں کی خون ریزی کرنا۔ سورہ عبس والی آیات اس وقت نازل ہوئیں جب رسول کریم ﷺ قریش کو دعوت اسلام دینے میں مگن تھے کہ ایک نابینا صحابی حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم حاضر خدمت ہوئے اور حضور ﷺ کو بلند آواز سے پکارنے لگے، جس کی وجہ سے کارِ دعوت میں خلل واقع ہوا۔ اگرچہ ان کا یہ عمل دانستہ نہیں تھا لیکن بہتر ہوتا کہ وہ پہلے رسول اللہ ﷺ کی مصروفیت کے بابت کسی دوسرے صحابی سے پوچھ لیتے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کا یہ رویہ ان کی تأدیب کے لیے تھا تا کہ لوگوں پر کارِ دعوت کی حساسیت نمایاں ہو جائے اور یہ بات تأدیب اخلاق کے منافی نہیں ہوتی۔ ماں اگر بیٹے کو ادب سکھاتے تھپڑ بھی مار دے تو کوئی احمق ہی اخلاق کے منافی قرار دے گا کیونکہ تادیب عین اخلاق ہے، اخلاق کے منافی نہیں۔

---

[41](عبس:۱،۲)

[42](محمد:۴)

[43]التفسیر الکبیر، ج ۳۰، ص ۸۱

اسی طرح مشرکین کی خونریزی بھی اخلاق کے منافی نہیں بلکہ عین اخلاق ہے جیسے ایک ماہر ڈاکٹر جسم کا وہ حصّہ کاٹ دیتا ہے جس سے جسم کے باقی حصے کے خراب ہونے کا خدشہ ہو۔ ایسا کرنا رحم دلی کے منافی ہوتا ہے اور نہ ہی اخلاقِ عالیہ کے بلکہ یہ ایک اعلیٰ اور بلند مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے ہی تمام تر محبتوں اور شفقتوں کے باوجود جو سرکش لوگ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے، انہوں نے اللہ کی زمین کو فساد سے بھر رکھا تھا، انہیں سخت سے سخت سزا دینا تا کہ وہ حق پرستی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں پوری انسانیت پر رحم اور عین اخلاق ہے اور اسلامی جہاد سے صرف مسلمانوں کو فائدہ نہیں ہوا بلکہ مخلوقِ خدا کو بادشاہوں کے جبر سے نجات ملی۔ اگر اسلام ان سرکشوں کو سخت سے سخت سزا نہ دیتا تو دنیا اس جبر سے نجات کیسے پاتی؟ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں بلکہ تادیب اور سرکشوں کو سزا دے کر انسانیت کو ان کے شرّ سے بچانا سب اخلاق عالیہ کے ہی مظاہر ہیں۔

9. ۹۔ دین میں جبر ہے یا نہیں؟

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ [44]

دین میں کوئی جبر نہیں۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُه وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ [45]

وہ اہل کتاب جو نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر اور جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے اور نہ دین حق کو اپنا دین تسلیم کرتے ہیں، آپ ان سے جنگ کریں۔

ان دونوں آیات کے متعلق بھی تضاد کا دعویٰ کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ دین میں جبر نہیں ہے اور دوسری آیت میں فرمایا کہ دین قبول نہ کرنے والوں سے لڑو۔

جب جبر نہیں تو پھر لڑائی کیوں؟ کہنے کو تو کوئی کچھ بھی کہہ سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں تضاد نام کی کوئی چیز نہیں۔ دین میں جبر نہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ دین قبول کرنے میں کس پر جبر نہیں کیا جائے گا اور جہاد کا مقصد انہیں جبراً مسلمان کرنا نہیں بلکہ جہاد کا مقصد یہ ہے کہ وہ دین الٰہی کی برتری کو قبول کریں اور ذمی بن کر جس عقیدے پر چاہیں رہیں اور سورۃ التوبہ کی اسی آیہ کریمہ کے آخری الفاظ اسی مفہوم کو خوب واضح کر رہے ہیں کہ فرمایا:

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ [46]

کہ ان سے اس وقت لڑو جب تک وہ اپنی پستی کا احساس کرتے ہوئے جزیہ نہ دیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد کا مقصد جبراً دین قبول کروانا نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے غلبہ اور تسلط کر منوانا ہے اور لا اکراہ فی الدین والی آیت تو نازل ہی اس وقت ہوئی تھی کہ بنو اوس کے کچھ بچے قبیلہ بنو نضیر کے ہاں رضاعت پر پلے تھے اور بنو نضیر یہودی تھے۔ ان بچوں نے کہا ہم تو یہودیوں کے ساتھ جائیں گے اور انہیں کا دین قبول کریں گے، تو بنو اوس نے چاہا کہ انہیں جبراً مسلمان کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیہ کریمہ نازل فرما کے بنو اوس کو ان بچوں کو جبراً مسلمان کرنے سے روک دیا۔[47]

واضح رہے کہ دین قبول کرنے میں کسی پر جبر نہیں ہے لیکن جب کوئی اپنی مرضی سے دین قبول کرلے تو پھر احکامات پر عمل کرنے میں ان پر سختی کی جاسکتی ہے۔ اس لیے یہ آیت بھی لا اکراہ فی الدین کے منافی نہیں ہے:

---

[44] (البقرہ:۲۵۶)

[45] (التوبہ:۲۹)

[46] (التوبہ:۲۹)

[47] ابو الحسن علی بن احمد الواحدی، کراچی، دارالاشاعت، ص۷۷

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّاذۡکُرُوۡا مَا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ 48

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے (تورات پر عمل کرنے کا) عہد لیا اور پھر (نافرمانی کرنے پر)، کوہ طور تمہارے اوپر بلند کر دیا کہ جو (کتاب) ہم نے تمہیں دی اسے مضبوطی سے تھامو۔

اور اس میں جو کچھ ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔ یہاں بھی دین میں ان پر کوئی جبر نہیں تھا بلکہ انہوں نے عہد اپنی مرضی سے باندھا۔ جب اسے توڑا تو ان پر سختی کی گئی۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

و المعنی ان اخذ المیثاق کان متقدما فلما نقضوہ بالامتناع عن قبول الکتاب رفع علیھم الجبل 49

کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے پہلے قبول کتاب کا عہد لیا گیا تو جب انہوں نے عہد توڑا تو پہاڑ ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دین میں جبر نہ ہونے اور حکم جہاد میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ جہاد کا مقصد جبراً دین قبول کروانا نہیں بلکہ کافروں کے فساد کو ختم کرنا ہے۔ قاضی مظہریؒ فرماتے ہیں:

فان الامر بالقتال و الجهاد ليس لاجل الاكراه على الدين بل لدفع الفساد من الارض فان الكفار يفسدون في الارض ويصدون عباداللّٰه عن الهدى والعبادة 50

جہاد اور قتال کا حکم دین پر جبر کرنے کے لیے نہیں بلکہ زمین سے فساد ختم کرنے کے لیے تھا کیونکہ کافر زمین میں فساد پھیلاتے تھے اور لوگوں کو ہدایت قبول کرنے اور عبادت الٰہی سے روکتے تھے۔

اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہے۔

10. ۱۰۔ سو مومن دو سو کافروں پر بھاری ہیں یا ہزار پر؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ عَلَی الۡقِتَالِ ؕ اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ ۚ وَ اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفًا مِّنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا 51

اے نبی (مکرم! ﷺ) مومنوں کو جہاد کی ترغیب دیں اگر تمہارے بیس آدمی ہوں جو ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمہارے سو آدمی ہوں تو وہ ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔

اس کے بعد فرمایا:

اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنۡکُمۡ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیۡکُمۡ ضَعۡفًا ؕ فَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ ۚ وَ اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ اَلۡفٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَیۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰہِ 52

اب اللہ نے تم پر آسانی کر دی اور وہ جانتا ہے کہ تمہارے اندر کچھ کمزوری ہے تو (اب حکم یہ ہے کہ) اگر تمہارے ثابت قدم رہنے والے سو ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمہارے ہزار آدمی ہوں تو وہ دو ہزار پر غالب آئیں گے۔

ان آیات کے متعلق بھی تضاد کا دعویٰ کیا گیا اور کہا گیا کہ پہلے کہا کہ سو مومن ہزار کافروں پر غالب آئے گا اور پھر کہا گیا کہ سو مومن دو سو پر غالب آئے گا حالانکہ آیات کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ پہلا حکم یہ تھا کہ مومن اس طرح جرأت و استقامت کا مظاہرہ کریں کہ سو مومن ہزار کافر پر غالب آ جائیں، پھر اللہ تعالیٰ

---

48 (البقرہ:۶۳)

49 تفسیر کبیر، ج۳، ص۱۰۷

50 تفسیر مظہری، ج۱، ص ۳۵۲

51 (الانفعال:۶۵)

52 (الانفعال:۶۶)

نے اہل ایمان پر نرمی کرتے ہوئے تخفیف کر دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری کمزوری سے آگاہ ہے اس لیے تم پر نرمی کی جاتی ہے اور پہلا حکم منسوخ کر کے دوسرا حکم یہ دیا جاتا ہے کہ سو مومن کو دو سو کافروں پر اور ہزار مومن کو دو ہزار کافروں پر غالب آنا چاہیے۔ اس دعویٰ تضاد کا بنیادی سبب یہ غلط فہمی ہے کہ یہاں شرط کو خبر سمجھ لیا جائے جبکہ شرط خبر کے معنی میں نہیں، امر کے معنی میں ہے یعنی مراد یہ نہیں ہے کہ اگر سو ہو گا تو ہزار پر غالب آئے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر سو ہو تو اسے ہزار پر غالب آنا چاہیے اور پھر نرمی کرتے ہوئے فرمایا کہ سو کو دو سو پر غالب آنا چاہیے۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں: شرط معنی الامر[53] کہ یہاں شرط امر کے معنی میں ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیات میں تضاد نام کی کوئی چیز نہیں بلکہ پہلی آیت میں ایک سخت حکم تھا، دوسری آیت میں اسے منسوخ کر کے نرم حکم دے دیا گیا۔

11. ۱۱۔ غزوہ بدر میں کتنے فرشتے آئے تھے؟

اس تناظر میں ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَٰئِكَةِ مُرْدِفِينَ[54]

جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری پکار کا جواب دیا کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرنے والا ہوں جو لگاتار آئیں گے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَٰثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَٰئِكَةِ مُنْزَلِينَ[55]

جب آپ مومنوں سے فرما رہے تھے کہ کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کر دے۔

پھر ارشاد ہوا:

بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَٰئِكَةِ مُسَوِّمِينَ[56]

کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور وہ لوگ اچانک تم پر ہلہ بول دیں تو تمہارا رب پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد فرمائے گا۔

ان آیات میں فرشتوں کی مختلف تعداد کو بھی قرآن میں تضاد کا نام دیا گیا حالانکہ یہاں ایک ترتیب کا بیان اور اللہ تعالیٰ کی پہلے سے بڑھ کر کرم فرمائی کا تذکرہ ہے۔ ان آیات کی تطبیق میں ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک ہزار فرشتے بھیجنے کا وعدہ فرمایا پھر مزید کرم فرماتے ہوئے انہیں تین ہزار کر دیا پھر یہ افواہ پھیلی کہ کرز بن جابر فہری اپنے لشکر کے ساتھ قریش کی مدد کو آرہا ہے چونکہ قریش کی تعداد مسلمانوں سے پہلے ہی تین گنا سے بھی زیادہ تھی، اس لیے لوگوں میں طبعی طور پر ایک بے چینی سی پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم صبر و تقویٰ کا مظاہرہ کرتے رہو اور وہ تم پر اچانک حملہ کر دیں تو میں پانچ ہزار فرشتے بھیج دوں گا لیکن چونکہ کرز بن جابر نہیں آیا اس لیے پانچ ہزار فرشتوں کی نوبت ہی نہیں آئی۔ البتہ تین ہزار فرشتے آئے اور دوسرا قول یہ ہے:-

انه امدهم اوّلا بها ثم صارت ثلاثه ثم صارت خمسة[57]

کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک ہزار سے مدد فرمائی پھر تین سے اور پھر پانچ ہزار سے۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں:

قيل امدهم الله يوم بدر اوّلا بالف من الملائكة ثم صاروا ثلاثة آلاف ثم صاروا خمسة آلاف[58]

---

[53] تفسیر بیضاوی، ج ۱، ص ۳۹۲

[54] (الانفعال: ۸)

[55] (آل عمران: ۱۲۴)

[56] (آل عمران: ۱۲۵)

[57] امام جلال الدین سیوطی، تفسیر جلالین، کراچی، قاسم پبلی کیشنز، ج ۱، ص ۲۶۵

[58] تفسیر بیضاوی، ج ۱، ص ۱۸۳

اور ایک قول یہ ہے کہ بدر کے دن پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتوں سے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ پھر وہ تین ہزار ہو گئے۔ پھر وہ پانچ ہزار ہو گئے۔ اس سے واضح ہوا کہ ان آیات میں ایک ترتیب اور اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی کا بیان ہے، کوئی تضاد نہیں ہے۔

12. ۱۲۔ گمراہ کون کرتا ہے؟

اس تناظر میں مندرجہ ذیل آیات میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا۔ ایک مقام پر شیطان کے متعلق فرمایا گیا:

اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیۡنٌ [59]

بے شک وہ واضح طور پر گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا کہ قیامت کے دن شیطان اللہ تعالیٰ سے ایک بھٹکے ہوئے انسان کے متعلق کہے گا۔

رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَكِنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ [60]

اے ہمارے پروردگار! اسے میں نے گمراہ نہیں کیا بلکہ یہ خود پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَمَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَہُوَ الۡمُہۡتَدِ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَہُمۡ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِہٖ [61]

اور جسے اللہ ہدایت دے وہی سیدھی راہ چلنے والا ہے اور جنہیں اللہ گمراہ کر دے تو اللہ کے سوا تمہیں ان کا کوئی مدد گار نہیں مل سکتا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ سَبِیۡلًا [62]

اور جسے اللہ گمراہ کر دے تم اس کے لیے کوئی راہِ راست نہیں پاؤ گے۔

ان آیات طیبات کے متعلق کہا گیا کہ ان میں تضاد ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا شیطان گمراہ کرتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا انسان خود گمراہ ہوتا ہے اور پھر فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے۔ یہ دعویٰ ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ یہاں حقیقت اور سبب کی نسبت کو فراموش کیا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہر کام کا فاعل حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن نظام الٰہی میں ہر کام ایک سبب کے تحت ہوتا ہے، اس لیے گمراہی کی نسبت کبھی حقیقت کی طرف کی جاتی ہے اور کبھی سبب کی طرف جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یَہَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَہَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ الذُّکُوۡرَ [63]

کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹا دیتا ہے۔

اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ بیٹے اور بیٹیاں اللہ ہی عطا کرتا ہے۔ لیکن جب جبریل امین حضرت مریم کے گریبان میں پھونک مار کے انہیں حضرت عیسیٰ علیہا السلام کی بشارت دینے آئے تو چونکہ وہ بیٹے کی پیدائش کا سبب بن رہے تھے۔ اس لیے بیٹا دینے کی نسبت اپنی طرف کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس لیے بھیجا ہے۔

لِاَہَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا [64]

تاکہ میں تجھے پاکیزہ بیٹا دوں۔

---

[59](القصص:۱۵)

[60](ق:۲۷)

[61](بنی اسرائیل:۹۷)

[62](النسائ:۸۸)

[63](الشوریٰ:۴۹)

[64](مریم:۱۹)

توان دونوں آیات میں کوئی تضاد نہیں بھب میں نسبت حقیقی کا ذکر ہے اور لاھب میں سبب کی طرف نسبت کرتے ہوئے نسبت مجازی کا بیان ہے۔ اسی طرح مذکورہ چاروں آیات میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کام کا فاعل حقیقی ہے۔ قانون الٰہی کے مطابق جو بندہ گمراہی کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ چونکہ گمراہی کا سبب شیطان بنتا ہے اور وہ انسان کو وسوسہ اندازی اور دیگر کئی طریقوں سے گمراہی کی ترغیب دیتا ہے۔ اس لیے گمراہی کی نسبت کبھی شیطان کی طرف کر دی جاتی ہے اور چونکہ انسان شیطانی وسوسوں کو قبول کرکے گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے اس لیے گمراہی کی نسبت کبھی انسان کی طرف کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف گمراہ کرنے کی نسبت فاعل حقیقی ہونے کی جہت سے ہے اور شیطان یا انسان کی طرف اس کا سبب ہونے کے ناطے اس لیے ان ایات میں تضاد کا دعویٰ ایک بے حقیقت بات ہے۔

13. ۱۳۔ کیا اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخش دے گا؟

اس تناظر میں ان دو آیات میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا [65]

کہ بے شک اللہ تعالیٰ سب گناہ معاف فرمادے گا۔

جبکہ دوسرے مقام پر فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ [66]

بے شک اللہ تعالیٰ اس چیز کو معاف نہیں کرتا کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے کم ہر گناہ کی جس کے لیے چاہتا ہے بخشش فرمادیتا ہے۔

ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے کہا گیا کہ پہلی آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ معاف فرمادیتا ہے اور دوسری آیت میں فرمایا کہ وہ شرک معاف نہیں کرتا تو اس لیے ان دونوں آیات میں تضاد ہے (نعوذ باللہ من ذلک)

حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی تضاد نہیں۔ پہلی آیت کا تعلق توبہ سے ہے کہ اگر کوئی توبہ کرلے تو توبہ کے سبب اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف فرمادے گا اور دوسری آیت کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی بغیر توبہ کے مرجائے تو اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے اس کے بھی جو گناہ چاہے معاف کردے گا لیکن شرک معاف نہیں فرمائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ شرک کے گناہ کو بغیر توبہ کے معاف نہیں کرتا۔ مفسر الصاوی فرماتے ہیں:

ای ان مات من غیر توبة [67]

یعنی اگر کوئی بغیر توبہ کے مرگیا تو اس کا شرک کا گناہ معاف نہیں ہوگا۔ مراد یہ ہے کہ شرک کے سوا باقی گناہ توبہ سے بھی معاف ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو بغیر توبہ کے محض اپنے فضل سے بھی معاف فرماسکتا ہے لیکن شرک کا گناہ اللہ تعالیٰ بغیر توبہ کے معاف نہیں کرتا۔ اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہے۔

14. ۱۴۔ اللہ تعالیٰ کی باتیں بدلی جاسکتی ہیں یا نہیں؟

اس تناظر میں بھی دو آیات سے حسبِ منشا استدلال کرتے ہوئے قرآن مجید میں تضاد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔

پہلی آیت ہے:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ [68]

اور تمہارے ربّ کی باتیں سچائی اور انصاف میں مکمل ہوگئیں اور اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

---

[65] (الزمر:۵۳)

[66] (النسائ:۱۱۶)

[67] تفسیر صاوی: ج ا، ص ۶۴

[68] (الانعام:۱۱۵)

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا [69]

ہم جب بھی کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔

ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہنا کہ پہلی آیت میں کہا گیا کہ اللہ تعالی کی باتیں بدلتی نہیں اور دوسری آیت میں کہا گیا کہ اللہ تعالی کی باتیں بدل جاتی ہیں، حقیقت سے بالکل محروم اور انتہائی سطحی سی بات ہے کیونکہ پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن مجید ہر لحاظ سے ایک مکمل اور محفوظ کتاب ہے اور کوئی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

والمراد بالكلمة القران أى تم القرآن فى كونه معجزا دالا على صدق محمد [70]

یہاں کلمہ سے مراد قرآن مجید ہے یعنی قرآن مجید اپنے معجزہ ہونے اور رسول کریم کی صداقت پر دلیل ہونے میں مکمل ہو گیا۔

جبکہ دوسری آیت سے مراد نسخ ہے، جس سے مراد ایک حکم شرعی کا دوسرے حکم شرعی سے بدلنا ہے جیسے مریض کی حالت بدلنے سے طبیب اس کی دوا تبدیل کر دیتا ہے۔ ایسے ہی جیسے جیسے لوگوں میں دین پختہ ہوتا گیا، اللہ تعالیٰ نے کچھ احکام بدل دیے جیسے پہلے صرف شراب کا نقصان واضح کیا گیا لیکن اسے حرام قرار نہیں دیا گیا۔ جب لوگوں میں دین راسخ ہوا تو شراب کو حرام قرار دے دیا گیا۔ ایسے ہی کسی سخت حکم کو نرم حکم سے بدل دیا گیا جیسے پہلے حکم تھا کہ سو مومن ہزار کافروں پر غالب آئیں اور پھر نرمی کرتے ہوئے فرمایا کہ سو مومن دو سو مومنوں پر غالب آئیں۔[71]

تو نسخ کو کلمات کی تبدیلی قرار دینا علوم قرآنی سے مکمل ناواقفیت کی دلیل ہے اور ان آیات میں تضاد نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں۔

15. ۱۵۔ ابلیس جنّ تھا یا فرشتہ؟

مندرجہ ذیل دو آیات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ قرآن کریم کے بیان میں اس سوال کے جواب میں تضاد ہے کہ ابلیس جنّ تھا یا فرشتہ۔ پہلی آیہ کریمہ یہ ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ [72]

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔

اور دوسرے مقام پر شیطان کے متعلق فرمایا:

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ [73]

وہ جنّات میں سے تھا تو اس نے اپنے ربّ کے حکم کی نافرمانی کی۔

ان آیات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ قرآن مجید میں ایک مقام پر ابلیس کو فرشتہ کہا گیا اور دوسرے مقام پر جنّ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بے دلیل بات ہے۔ شیطان کی اصل کے بارے میں اگرچہ طویل مباحث موجود ہیں لیکن بعض اصولی باتوں کی روشنی میں حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ فرشتوں کے متعلق یہ واضح فرمایا گیا:

لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ [74]

وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو انہیں حکم دیا جائے وہی بجالاتے ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور پھر کان من الجنّ تو نص ہے کہ وہ جنّوں میں سے تھا۔ یہاں تک سطورِ بالا میں مذکور سورۃ البقرہ کی آیت ۳۴ کا تعلق ہے تو اس میں شیطان کا فرشتوں سے استثناء کیا گیا ہے۔ وہاں یہ تو نہیں کہا گیا کہ وہ فرشتوں میں سے تھا، صرف یہ فرمایا گیا کہ فرشتوں نے

---

[69] (البقرہ:۱۰۶)

[70] تفسیر کبیر، ج۱۳، ص ۱۶۰

[71] (الانفال:۶۶)

[72] (البقرہ:۳۴)

[73] (الکہف:۵۰)

[74] (التحریم:۶)

سجدہ کیا، ابلیس نے نہیں کیا۔ استثناء تو متصل بھی ہو سکتا ہے اور منقطع بھی۔ تو یہاں واضح نصوص کا تقاضا ہے کہ اس سے مراد مستثنیٰ منقطع لیا جائے کہ یہ فرشتوں میں سے نہیں تھا لیکن چونکہ فرشتوں کے ساتھ عبادت کرتا تھا تو جو حکم اعلیٰ کو دیا جائے، ادنیٰ اس میں بدرجہ اولیٰ شامل ہوتا ہے۔ جس کی تعظیم بادشاہ کرے گا، رعایا پر اس کی تعظیم بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گی۔ چنانچہ جب فرشتوں کو حکم دیا گیا تو شیطان بدرجہ اولیٰ اس حکم میں شامل ہو گیا۔ اس آیت سے اس کی سرکشی ثابت ہوتی ہے۔ اس کا فرشتوں میں سے ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہاں مستثنیٰ متصل نہیں منقطع ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سجدہ کے حکم میں جنّات بھی شامل ہوں۔

لکنه استغنی عن ذکرهم بذکر الملائکة لان الاکابر لما امروا بالسجود فالاصاغر اولیٰ [75]

لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد جنوں کا الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہی کیونکہ جب اکابر کو سجدے کا حکم دیا گیا تو اصاغر اس میں بدرجہ اولیٰ شامل ہو گئے۔

اس بحث میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

و الراجح لدی القول الاوّل لصریح آیة کان من الجن والأنّ ابلیس قدعصی امر ربه و الملائکة لا یعصون اللّٰه ما امرهم [76]

اور میرے نزدیک راجح قول پہلا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا کیونکہ اس پر صریح آیت دلیل ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا اور ابلیس نے تو اپنے ربّ کی نافرمانی کی اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا اور ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

16. ۱۶۔ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی یا پانی سے؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا [77]

اور وہ وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ [78]

وہ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔

ان آیات کی روشنی میں بھی قرآن میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا کہ ایک مقام پر کہا کہ انسان کی تخلیق پانی سے ہوئی اور دوسرے مقام پر فرمایا کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی حالانکہ ان آیات میں تضاد نام کی کوئی چیز بالکل نہیں ہے کیونکہ حضرت آدم علیہا السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور پھر تمام انسانوں کی تخلیق قطرہ آب سے ہوئی یہاں خلقکم سے مراد ہے ۔

بخلق ابیکم آدم منه [79]

تمہارے باپ آدم علیہا السلام کو مٹی سے پیدا کر کے۔

یعنی خَلَقَكُم ْ سے مراد ہے خلق اباکم کہ تمہارے باپ آدم علیہا السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر بعد میں نسل انسانی قطرہ آب سے چلی یعنی پہلی آیت میں عام انسانوں کی تخلیق کا ذکر ہے جو مشاہداتی طور پر بھی بالکل واضح ہے اور دوسری آیت میں تخلیق آدم علیہا السلام کا ذکر ہے جس کی خبر قرآن وسنت میں دی گئی کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا گیا۔

---

[75] تفسیر مظہری، ج۱، ص۶۶

[76] التفسیر المنیر، ڈاکٹر وھبہ زحیلی، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، ج۱، ص۱۴۶

[77] (الفرقان:۵۴)

[78] (الانعام:۲)

[79] جلالین، ج۱، ص ۱۶۲

ان آیات میں تطبیق کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق قطرہ آب سے ہوتی ہے جو خوراک سے بنتا ہے اور خوراک مٹی سے پیدا ہوتی ہے تو قطرہ آب انسان کی تخلیق کا سببِ قریب ہے اور مٹی سببِ بعید۔ تو پہلی آیت میں سببِ قریب کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں سببِ بعید کا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

17. ۱۷۔ شراب شیطانی کام ہے یا نعمت؟

قرآن مجید میں ایک مقام پر فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ [80]

اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے تھان اور جوئے کے تیر، یہ سب نجس شیطانی کام ہیں، ان سے بچو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا [81]

اور کھجور کے پھلوں اور انگوروں سے بھی (ہم تمہیں ایک مشروب دیتے ہیں) جس سے تم شراب بھی بناتے ہو اور پاکیزہ رزق بھی۔

ان دونوں آیات سے استدلال کرتے ہوئے کہا گیا کہ قرآن مجید کا بیان متضاد ہے کہ ایک جگہ شراب کو شیطانی کام کہا اور دوسری جگہ شراب کا ذکر نعمتوں میں کیا۔ یہاں تضاد قطعاً نہیں ہے۔ شراب شیطانی کام ہی ہے۔ یہ حرام بھی ہے اور نجس بھی۔ یہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے کہ وہاں شراب کا ذکر نعمتوں کے ساتھ کیا گیا ہے تو مفسرین کرام نے اس کے تین اسباب بیان کیے ہیں: ان کے نزدیک یا تو یہ سورت مکی ہے اور شراب مدینہ منورہ میں حرام ہوئی چونکہ اس وقت تک شراب حرام نہیں تھی، اس لیے اس کا ذکر کیا گیا لیکن اسے رزق حسن کے مقابل ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ شراب رزق حسن نہیں ہے، اس لیے اس سے بچو۔ یہ امام شعبیؒ اور امام نخعیؒ کی رائے ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان یجمع بین العتاب والمنۃ 82 یعنی یہاں عتاب اور احسان دونوں جمع کیے گئے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تو تمہیں کھجور اور انگور کے پاکیزہ پھل دیتے ہیں اور تم اس سے شراب بنانے لگتے ہیں؟ اور اسی سے پاکیزہ چیزیں بھی بناتے ہو۔ چنانچہ شراب کا تعلق عتاب سے ہے اور رزق حسن کا احسان سے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگرچہ سکر کا لفظ عموماً شراب کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن بہر حال یہ خمر کا مترادف نہیں ہے۔ اس سے مراد کوئی میٹھا رس وغیرہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہاں سکر سے مراد شراب نہیں ہے بلکہ نبیذ ہے اور اس سے مراد ہے:

عصیر العنب والذبیب والتمراذا طبخ حتی یذہب ثلثاہ ثم۔ یترک حتی یشتد وھو حلال عند ابی حنیفة و ابی یوسف الی حد السکر [83]

انار، انگور اور کھجور کا رس جب اسے اتنا پکایا جائے کہ اس کا دو تہائی ختم ہو جائے پھر اسے چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ اس میں سختی آ جائے تو یہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک اتنی مقدار میں حلال ہے جب تک وہ نشہ کی حد کو نہ پہنچے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں آیات میں کوئی تضاد نہیں۔

18. ۱۸۔ کیا بیویوں میں انصاف ممکن ہے؟

قرآن کریم میں واضح فرمایا گیا ہے کہ ایک انسان کو چار عورتوں تک نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ پھر فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ [84]

ہاں! اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم (ان بیویوں میں) انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر صرف ایک عورت ہی سے نکاح کرو یا وہ کنیزیں جو تمہاری ملکیت ہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

---

[80] (المائدہ:۹۰)

[81] (النحل:۶۷)

[82] الکشاف، ج۲، ص۵۷۶

[83] مدارک، ج۲، ص۲۲۱

[84] (النساء: ۳)

وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ [85]

اور تم بیویوں میں انصاف نہیں کر سکتے اگر چہ تم جتنا بھی چاہو۔ البتہ کسی ایک کی طرف پورے پورے نہ جھک جاؤ کہ دوسری درمیان میں لٹکی ہوئی چیز کی طرح ہو جائے۔

ان دونوں آیات کے متعلق کہا گیا کہ ان میں قرآن مجید کا بیان مختلف ہے کہ ایک مقام پر کہا کہ بیویوں میں عدل کر سکتے ہو تو نکاح کر و اور دوسرے مقام پر کہا کہ تم ان میں ہر گز عدل نہیں کر سکتے تو پھر چار بیویوں تک نکاح کرنے کی اجازت کا مقصد کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں بلکہ یہ حکم عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے کیونکہ انسان بعض چیزوں میں انصاف کر سکتا ہے اور بعض میں نہیں۔ ایک انسان کے لیے یہ تو ممکن ہے کہ وہ نفقہ، سکنیٰ اور دیگر معاملاتِ حیات میں سب بیویوں میں انصاف کرے اور سب کو برابر نفقہ اور سکنیٰ وغیرہ دے لیکن وہ یہ نہیں کر سکتا کہ وہ دو بیویوں سے برابر کی محبت کرے۔ پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم چار عورتوں سے نکاح اس وقت کر سکو گے جب نفقہ، سکنیٰ اور وقت وغیرہ میں برابری کر و اور دوسری آیت کا مقصد یہ ہے کہ تم قلبی رجحان اور محبت میں کبھی بھی برابری تو نہیں کر سکو گے البتہ حتیٰ الامکان کوشش ضرور کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری پورا جھکاؤ ایک کی طرف ہو جائے اور دوسری درمیان میں لٹکتی رہے کہ نہ تو تم اسے بیوی کے حقوق دو اور نہ ہی آزاد کرو۔

یہ حکم فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ ان دونوں باتوں کو متضاد کہنا انسانی فطرت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ عدل کرنے کا حکم نان و نفقہ اور سکنیٰ کے متعلق ہے اور عدل نہ کر سکنے کا تعلق قلبی جھکاؤ اور محبت سے ہے۔ آیت کریمہ میں خود اس کی وضاحت کر دی گئی کہ ان معاملات میں تم انصاف تو نہیں کر سکو گے البتہ ممکنہ حد تک کوشش ضرور کرو ایسا نہ ہو کہ ایک تو بیوی بن کے رہے اور دوسری درمیان میں لٹکتی رہے، نہ اسے بیوی کے حقوق دو اور نہ ہی آزاد کرو۔ چونکہ انسان تکلیف مالا یطاق کا مکلف نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا [86]

اللہ تعالیٰ کسی بھی انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر حکم نہیں دیتا۔

اس لیے دیگر معاملات میں انصاف نکاح کی شرط ہے لیکن محبت میں ممکنہ حد تک انصاف کرنے کا حکم ہے۔

وقيل معناه ان تعدلوا في المحبة [87]

اور ایک قول یہ ہے کہ یہاں عدل نہ کر سکنے سے مراد محبت میں عدل ہے۔

چنانچہ رسول کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کرتے تھے:

هذه قسمتي فيما املك فلا تلمني فيما تملك ولا املك [88]

اے اللہ! بیویوں کے درمیان یہ میری وہ تقسیم جو میرے اختیار میں ہے اور تو اس چیز میں مجھے ملامت نہ فرمانا جو تیرے اختیار میں ہے، میرے اختیار میں نہیں۔

اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہے۔

19. ۱۹۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب لوگوں سے کلام کرے گا یا نہیں؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت کے بدلہ میں بیچ دیا ان کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں پھر فرمایا:

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنۡظُرُ اِلَيۡهِمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيۡهِمۡ [89]

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا۔

---

[85] (النساء:۱۲۹)

[86] (البقرہ:۸۶)

[87] الکشاف، ج۱، ص۶۰۵

[88] سنن ترمذی، باب ماجاء فی التسویة، بیروت، دار الغرب الاسلامی، رقم الحدیث ۱۱۴۰، ج۲، ص۴۳۷

[89] (آل عمران:۷۷)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ [90]

تو آپ کے رب کی قسم! ہم سب سے ان کے اعمال کے متعلق پوچھیں گے۔

ان دونوں آیات کے متعلق بھی تضاد کا دعویٰ کیا گیا اور کہا گیا کہ پہلی آیت میں منکرین سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی نفی ہے جبکہ دوسری آیت سب سے کلام کرنے کا ذکر ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی ان آیات میں تضاد ہے۔ جبکہ درحقیقت ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے یا تو اس لیے کہ یہاں جس کلام کی نفی ہے وہاں کلام محبت والطاف مراد ہے اور یہاں کلام کا اثبات ہے، وہاں کلام غضبی مراد ہے جو منکرین کے لیے اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کا اظہار ہو گا یا یہاں کلام کی نفی ہے، وہاں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا بلاواسطہ کلام کرنا ہے اور یہاں کلام کا اثبات ہے، وہاں فرشتوں کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا مراد ہے۔

امام بیضاوی لاَ يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

بما يسرهم اوبشئی اصلا و ان الملائكة يسئلونهم يوم القيامة اولاينتفعون بكلمات اللّٰه و آياته والظاہر انه كناية عن غضبه عليهم [91]

یعنی اللہ تعالیٰ ان سے ایسا کلام نہیں کرے گا جو انہیں خوش کرے یا اللہ تعالیٰ ان سے بالکل کلام نہیں کرے گا اور قیامت کے دن ان سے سوال فرشتے کریں گے یا وہ اللہ تعالیٰ کے کلمات اور اس کی آیات سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے اور ظاہر ہے یہ ان کے لیے غضب الٰہی کا کنایہ ہے۔

مراد یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔ یہاں نفی ایسے کلام کی ہے جو انہیں خوش کرے جبکہ ان سے سوال کرنا تو انہیں عذاب دینے کے لیے ہو گا یا اللہ تعالیٰ ان سے بالکل کلام نہیں کرے گا اور ان سے سوال فرشتے کریں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنا کوئی حکم کارندوں کے ذریعے سے اپنی رعایا تک پہنچائے اور پھر کہے کہ ہم نے اپنی رعایا کو یہ حکم دیا ہے، یہی اسلوب یہاں اختیار کیا گیا ہے۔ ان سے ایسے کلام کی نفی ہے جو انہیں فائدہ دے اور سوال کرنے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ نقصان ہو گا۔ اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہوتی ہے۔

20. ۲۰۔ مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا خود انسان کی طرف سے؟

اس تناظر میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ [92]

کوئی مصیبت حکم الٰہی کے بغیر نہیں آتی۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ [93]

اور تمہیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچتی ہے اور وہ بہت سے کاموں سے درگزر فرماتا ہے۔

ان آیات کے متعلق بھی تضاد کا دعویٰ کیا گیا کہ پہلی آیت میں کہا گیا کہ مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور دوسری آیت میں کہا گیا کہ انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ درست بات یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ایک آیت میں جو اجمال ہے دوسری میں اسی کی تفسیر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا فاعل حقیقی اور خالق ہے اور اللہ تعالیٰ کا ضابطہ یہ ہے کہ وہ انسان کو نعمتیں تو محض اپنے فضل سے دیتا ہے اور مصیبت انسان کے اعمال کی وجہ سے اس پر نازل کرتا ہے چنانچہ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

---

[90] (الحجر: ۹۲، ۹۳)

[91] تفسیر بیضاوی، ج۱، ص ۱۷۱

[92] (التغابن: ۱۱)

[93] (الشوریٰ: ۳۰)

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ [94]

تمہیں جو اچھائی پہنچتی ہے تو وہ محض اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے اپنے سبب سے ہوتی ہے۔

تو مصیبت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فاعل حقیقی اور ہر چیز کے خالق ہونے کی نسبت سے ہے اور بندوں کی طرف نسبت اس مصیبت کا سبب ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔ واضح رہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق مصیبت صرف گناہوں کے سبب ہی نہیں آتی کبھی نیک بندوں کی آزمائش یا ان کے درجات بلند کرنے کے لیے ان کی آزمائش کے طور پر بھی آتی ہے۔

21. ۲۱۔ قرآن مجید صرف متقین کے لیے ہدایت ہے یا تمام لوگوں کے لیے؟

اس تناظر میں تضاد کا دعویٰ کرتے ہوئے ان دو آیات سے استدلال کیا گیا۔ ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ [95]

یہ متقین کے لیے ہدایت ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ [96]

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا جو تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔

ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے کہا گیا کہ پہلی آیت میں کہا کہ قرآن متقین کے لیے ہدایت ہے اور دوسری آیت میں کہا کہ تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ اس سے قرآن مجید کے بیان میں اختلاف واضح ہوتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں آیات اپنی جگہ پر حقیقت ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قرآن مجید ہدایت تو تمام لوگوں کے لیے ہے لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو تقویٰ کے طالب ہوتے ہیں چنانچہ قرآن مجید اپنی اصل کے اعتبار سے سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے لیکن انجام کے اعتبار سے اس سے صرف متقین ہی کے لیے ہدایت ہے۔ چنانچہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں انجام کا ذکر ہے اور هُدًى لِّلنَّاس میں اصل کا۔

وتخصيص الهدى بالمتقين باعتبار الغاية [97]

اور متقین کے ساتھ ہدایت کی تخصیص انجام کے اعتبار سے ہے

اس بات کو ہدایت کی اقسام کے اعتبار سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہدایت کی دو قسمیں ہیں ایک اراءۃ الطریق دوسری ایصال الی المطلوب۔ اراءۃ الطریق سے مراد صرف راستہ دکھاتا ہے اور ایصال الی المطلوب سے مراد منزل مقصود تک پہنچا دینا ہے۔ مراد یہ ہے اراءۃ الطریق کے اعتبار سے قرآن مجید تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے کہ سب کو راستہ دکھاتا ہے اور ایصال الی المطلوب کے اعتبار سے صرف متقین کے لیے ہدایت ہے کہ جو لوگ تقویٰ کے طالب ہوتے ہیں قرآن مجید انہیں منزل مقصود یعنی اللہ تعالیٰ کی حریم ناز تک پہنچا دیتا ہے۔ تو یہ دونوں آیات لوگوں کی دو قسموں کے اعتبار سے ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں۔

22. ۲۲۔ جادوگر حضرت موسیٰ علیہا السلام پر ایمان لائے تھے یا نہیں؟

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ [98]

فرعون اور اس کے سرداروں کے فتنہ کے خوف سے موسیٰ علیہا السلام پر ان کی قوم کے چند نوجوان ہی ایمان لائے۔

---

[94] (النساء:۷۹)

[95] (البقرہ:۲)

[96] (البقرہ:۱۸۵)

[97] تفسیر بیضاوی، ج۱، ص ۲۳

[98] (یونس:۱۰)

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہا السلام کی لاٹھی سے بننے والا اژدہا جادوگروں کے سانپوں کو نگل گیا تو اس وقت جادوگر سجدے میں گر گئے:

وَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ [99]

اس واقعہ نے جادوگروں کو بے ساختہ سجدہ میں گرا دیا اور وہ پکار اٹھے کہ ہم تمام جہانوں کے پروردگار پر ایمان لے آئے۔

ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے قرآن مجید میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا ہے کیونکہ پہلی آیت سے واضح ہوتا ہے کہ آپ پر آپ کی قوم کے ہی چند نوجوان ایمان لائے تھے کوئی اور نہیں۔ جبکہ دوسری آیات سے واضح ہوتا ہے کہ آپ پر جادوگر بھی ایمان لائے تھے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں تضاد کا دعویٰ کرنا ایک بہت بے حقیقت اور انتہائی سطحی سی بات ہے کیونکہ جادوگر بعد میں حضرت موسیٰ علیہا السلام سے مقابلہ کرنے کے بعد مسلمان ہوئے تھے جبکہ جس آیت میں چند نوجوانوں کے مسلمان ہونے کا ذکر ہے وہ آپ کے دعویٰ رسالت کے بعد فوری حالات کا بیان ہے:

فما امن الموسیٰ کی تفسیر میں علامہ الزمخشری لکھتے ہیں:

فی اوّل امرہ [100]

یعنی آپ کے دعویٰ رسالت کے بعد شروع شروع میں آپ پر چند نوجوان ہی ایمان لائے تھے۔ امام نسفی نے بھی یہی لکھا ہے۔[101]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کی قوم میں سے صرف چند نوجوانوں کا آپ پر ایمان لانا آپ کے دعویٰ رسالت کے بعد ابتدائی دنوں کی بات ہے اور جادوگروں کا مسلمان ہونا اس سے بہت بعد کی بات ہے۔ اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

23. ۲۳۔ شیطان کو لوگوں کا دوست اللہ تعالیٰ بناتا ہے یا لوگ خود؟

قرآن مجید میں ایک مقام پر فرمایا:

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ [102]

بے شک ہم نے شاطین کو انہیں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

اِنَّہُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ [103]

بے شک ان لوگوں نے اللہ کے بجائے شیطانوں کو اپنا دوست بنالیا ہے۔

ان آیات سے متعلق کہا گیا کہ پہلی آیت میں فرمایا کہ شیطانوں کو لوگوں کا دوست اللہ تعالیٰ بناتا ہے اور دوسری آیت میں کہا گیا کہ لوگ خود شیطانوں کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ اس لیے ان آیات میں تضاد ہے۔ لیکن درحقیقت یہاں تضاد کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف شیطانوں کو سرکش لوگوں کے دوست بنانے کی نسبت فاعل حقیقی اور ہر چیز کا خالق ہونے کی وجہ سے ہے اور لوگوں کی طرف اس کا سبب ہونے کی وجہ سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب کوئی انسان راہِ حق سے انحراف کرکے شیطان کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرتا ہے تو اللہ جبراً اسے روکتا نہیں بلکہ بطور سزا شیطانوں کو اس پر مسلط کر دیتا ہے اور اس کے لیے شیاطین کی دوستی کو مزین کر دیتا ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

وَکَذٰلِکَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ [104]

اس طرح ہم ان کے کرتوتوں کے سبب بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں۔

---

[99] (الاعراف:۱۱۹۔۱۲۰)

[100] تفسیر الکشاف:ج۲،ص۳۴۵

[101] تفسیر مدارک:ج۲،ص۳۶

[102] (الاعراف:۲۷)

[103] (الاعراف:۳۰)

[104] (الانعام:۱۲۹)

تو یہاں اس فعل کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت خلق کے اعتبار سے ہے اور بندوں کی طرف کسب کے اعتبار سے۔ لہٰذا ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔ ان دونوں آیات سے واضح ہوتا ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے لیکن بندے اپنے افعال کے کاسبب خود ہیں۔ اس لیے وہ اپنے افعال کے جواب دہ ہیں۔ اس طرح یہ آیات معتزلہ کے خلاف حجت ہیں جو بندوں کو ہی اپنے افعال کا خالق مانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو نہیں۔ امام نسفیؒ فرماتے ہیں:

والآية حجة لنا على الاعتزال في الهداية والضّلال [105]

کہ یہ آیت ہدایت اور گمراہی میں معتزلہ کے خلاف ہمارے حق میں دلیل ہے۔

یعنی ان افعال کی خلق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور کسب کی بندوں کی طرف۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

24. ۲۴۔ کیا حضور ﷺ سے بات کرنے سے پہلے اہل ایمان کو صدقہ کرنے کا حکم ہے یا نہیں؟

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً [106]

اے ایمان والو! جب تم رسول (کریم ﷺ) سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس تنہائی کی بات سے پہلے صدقہ کیا کرو۔

اس سے اگلی آیت میں ہے:

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۚ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ [107]

کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی سرگوشی کی بات سے پہلے صدقات دیا کرو۔ تو جب تم ایسا نہیں کرسکتے اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے تم پر متوجہ ہوا تو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

ان دونوں آیات سے استدلال کرتے ہوئے بھی قرآن کریم میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا اور کہا گیا کہ پہلی آیت میں صدقہ دینے کا حکم ہے اور دوسری آیت میں اسی حکم کی نفی ہے۔

تضاد کا یہ دعویٰ علوم قرآن سے ناواقفیت اور بہت سطحی سی بات ہے کیونکہ دوسری آیت میں فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا کے الفاظ واضح انداز میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ پہلی آیت میں جو صدقہ کرنے کا حکم تھا اس پر عمل کرنا لوگوں کو مشکل محسوس ہوا تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر نرمی کرتے ہوئے پہلا حکم منسوخ کردیا اور دوسری آیت میں حکم دیا کہ چونکہ تم ایسا نہیں کرسکتے، اس لیے صدقہ کرنے کا حکم منسوخ کیا جاتا ہے۔ اب نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ تو ان آیات میں تضاد نہیں بلکہ نسخ ہے۔ پہلی آیت کے حکم کو دوسری آیت نے منسوخ کردیا ہے۔

جب کچھ لوگ حضور اکرم ﷺ سے بہت زیادہ سرگوشیاں کرنے لگے اور ان کا یہ رویہ آپ پر شاق گزرا تو اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت نازل فرمائی۔ جب لوگوں نے اس حکم کو مشکل سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت نازل فرماکے پہلے حکم کو منسوخ کردیا۔ [108] پہلا حکم بہت جلد منسوخ ہوگیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

آية في كتاب الله لم يعمل بها احد قبلي ولا يعمل احد بعدي وهي اية المناجاة [109]

قرآن مجید میں ایک ایسی آیت ہے جس پر (میرے سوا) نہ مجھ سے پہلے کسی نے عمل کیا نہ میرے بعد اور وہ سرگوشی کے حکم والی آیت ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں تضاد نہیں نسخ ہے۔

---

[105] تفسیر مدارک، ج۱، ص ۵۶۴

[106] (المجادلۃ:۱۲)

[107] (المجادلۃ:۱۳)

[108] اسباب النزول للواحدی، ص ۳۹۵

[109] تفسیر مظہری، ج۷، ص ۶۰

۲۵۔ زمین و آسمان الگ الگ تھے یا ملے ہوئے؟

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا [110]

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھوئیں کی شکل میں تھا اور اس نے اس سے اور زمین سے کہا چلے آؤ چاہے خوشی سے یا ناگواری سے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا [111]

جن لوگوں نے کفر کیا، کیا انہوں نے کبھی آسمانوں اور زمین میں غور نہیں کیا کہ وہ باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں کھول دیا۔

ان آیات کی روشنی میں بھی تضاد کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا گیا کہ پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ زمین و آسمان الگ الگ تھے اور دوسری آیت میں فرمایا گیا کہ وہ ملے ہوئے تھے لہٰذا قرآن کا بیان متضاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں زمین و آسمان کے تخلیقی مراحل کے اعتبار سے بات کی گئی ہے۔ ان میں تضاد نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ رتق کا لفظی معنی ہے دو چیزوں کا بند یا ملا ہوا ہونا۔ زمین و آسمان کے بند یا ملے ہوئے ہونے سے مراد یا تو یہ ہے کہ آسمان سے بارش نہیں برستی تھی اور آسمان سے سبزہ نہیں اُگتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بارش برسائی اور زمین سے سبزہ اُگایا۔ یہ ضحاک عکرمہ اور مجاہد کا قول ہے۔ اس صورت میں تو دعویٰ تضاد کی کوئی صورت ہی نہیں بنتی۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان پہلے ملے ہوئے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں الگ الگ کر دیا۔

كان الجميع متصلاً بعضه ببعض متلاصق متراكم بعضه فوق بعض في ابتداء الامر ففتق هذه من هذه فجعل السموات سبعاً والارض سبعا [112]

ابتداء میں زمین و آسمان ملے ہوئے اور ایک دوسرے کے اوپر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں الگ الگ کر کے سات آسمان اور سات زمینیں بنا دیا۔

اس صورت میں بھی یہاں تضاد کی کوئی صورت نہیں ہے کہ وہ پہلے ملے ہوئے تھے پھر انہیں الگ الگ کر کے حکم دیا۔ تو اس میں تضاد کہاں سے آگیا؟

۲۶۔ کیا اللہ کے سوا کوئی دوست یا مددگار ہے؟

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ [113]

اور اللہ کے سوا نہ تمہارا کوئی دوست ہے نہ مددگار۔

جبکہ ایک اور مقام پر فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتے ہیں اور راہِ استقامت اختیار کرتے ہیں تو ان پر فرشتے اترتے ہیں جو انہیں خوف و حزن سے آزادی اور جنت کی بشارت دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں:

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ [114]

کہ ہم دنیا اور آخرت میں تمہارے دوست ہیں۔

ان آیات کے متعلق کہا گیا کہ پہلی آیت میں اللہ کے سوا کسی کی دوستی کی نفی ہے جبکہ دوسری آیت میں فرشتوں کی دوستی کا اثبات ہے لہٰذا اس تناظر میں قرآن مجید کا بیان مختلف ہے۔ حالانکہ ان آیات کا مطلب بالکل واضح ہے۔ یہاں کافروں کے لیے جس دوستی کی نفی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ہے کہ جب عذاب الٰہی آئے گا تو کوئی تمہارا دوست نہیں ہو گا جو تمہیں اس عذاب سے بچا سکے۔

---

[110] (حم السجدہ:۱۱)

[111] (الانبیاء:۳۰)

[112] علامہ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، القاہرہ، دار الحدیث، ج۳، ص ۱۷۲

[113] (العنکبوت:۲۲)

[114] (حم السجدہ:۳۱)

يمنعكم منه وينصر كم من عذابه [115]

جو تم سے عذاب دور کرے اور عذاب الٰہی میں تمہاری مدد کرے۔

اور مومنوں کے لیے فرشتوں کی جس دوستی کا اثبات ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو نعمت کے طور پر دی ہے:

كما ان الشياطين قرناء العصاة و اخوانهم فكذلك الملائكة اولياء المتقين [116]

مراد یہ ہے کہ جیسے گنہگاروں پر شیاطین مسلط کر کے ان کے ساتھی اور بھائی بنا دیے جاتے ہیں ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرشتوں کو نیک بندوں کے دوست بنا دیتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ کافروں کے لیے جس دوستی کی نفی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں مدد کرنے والی دوستی ہے اور اہل ایمان کے لیے فرشتوں کی جس دوستی کا ذکر ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہی بنانے سے ہے۔ اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں

۲۷۔ بنی اسرائیل بچھڑے کی پوجا پر نادم ہوئے یا ڈٹ گئے ؟

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰى یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰى [117]

وہ بولے جب تک موسیٰ علیہا السلام واپس نہ آجائیں ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَلَمَّا سُقِطَ فِیْۤ اَیْدِیْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا الا قَالُوْا لَىٕنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَیَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ [118]

اور جب وہ اپنے کیے پر نادم ہوئے اور سمجھ گئے کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے اگر ہمارے ربّ نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہماری بخشش نہ کی تو ہم یقینا خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

ان آیات کی روشنی میں بھی قرآن مجید میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا اور کہا گیا کہ پہلی آیت میں تو بیان کیا گیا کہ وہ بچھڑے کی عبادت پر ڈٹ گئے تھے اور دوسری آیت میں کہا گیا کہ وہ نادم ہو گئے۔

تضاد کے اس دعویٰ کا حقیقت سے کوئی تعلق بالکل نہیں ہے۔ پہلی آیت میں یہی کہا گیا تھا کہ ہم موسیٰ علیہا السلام کی آمد تک اس کی عبادت میں مگن رہیں گے اور دوسری آیت میں ان کی جس ندامت کا ذکر ہے وہ موسیٰ علیہا السلام کے آنے کے بعد کا ہے اور اس کے بعد والی آیت میں حضرت موسیٰ علیہا السلام کے واپس آنے کے احوال کا تذکرہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس اس لیے ہو گیا کہ حضرت موسیٰ علیہا السلام اس حالت غضب میں واپس آئے تھے اور انہوں نے لوگوں کو ان کی اس غلطی پر شدید الفاظ میں ڈانٹا تھا۔ اس پر تمام مفسرین متفق ہیں کہ بنی اسرائیل کو یہ ندامت حضرت موسیٰ علیہا السلام کی واپسی کے بعد ہی ہوئی تھی۔ علامہ مظہریؒ لکھتے ہیں:

والحاصل انهم ندموا على عبادة العجل حين جاءهم وعاتبهم موسیٰ [119]

اور خلاصہ بحث یہ ہے کہ وہ بچھڑے کی پوجا پر نادم اس وقت ہوئے جب ان کے پاس حضرت موسیٰ علیہا السلام آئے اور آپ نے انہیں جھڑکا۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:

و ذالک بعد رجوع موسیٰ [120]

---

[115] تفسیر جلالین، امام جلال الدین سیوطی، کراچی، قاسم پبلی کیشنز، ج۴، ص ۳۱۳

[116] تفسیر مدارک، ج۳، ص ۲۳۶

[117] (طٰہٰ:۹۱)

[118] (الاعراف:۱۴۹)

[119] تفسیر مظہری، ج۳، ص ۸۴

[120] جلالین، ج۲، ص ۲۹۰

اور بنی اسرائیل کی یہ ندامت حضرت موسیٰ علیہاالسلام کے واپس آنے کے بعد تھی۔

اس کے بعد والی آیت حضرت موسیٰ علیہاالسلام کے لوٹنے کے احوال کو بیان کرتی ہے:

اخبر سبحانه بحال موسیٰ علیه السلام معهم عند رجوعه الیهم من الغضب للّٰه [121]

(اس کے بعد) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہاالسلام کی اس حالت کو بیان کیا جو ان کی طرف لوٹتے وقت اللہ کے لیے غضب کا سبب تھی۔

مراد یہ ہے کہ اس سے بعد والی آیت ولمارجع موسیٰ۔ سے یہ مراد نہیں ہے کہ انہوں نے ندامت کا اظہار پہلے کیا اور حضرت موسیٰ علیہاالسلام بعد میں لوٹے بلکہ گوسالہ پرستی کرنے والوں نے ندامت کا اظہار حضرت موسیٰ علیہاالسلام کے لوٹنے کے بعد کیا تھا اور یہ آیت ان کے لوٹنے کی حالت کو بیان کرتی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی بات تمام شکوک وشبہات کا ازالہ کر دیتی ہے۔ وہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ ندامت و استغفار کا واقعہ حضرت موسیٰ علیہاالسلا کی واپسی کے بعد کا ہے جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے۔ آیت نمبر ۱۴۸ کے بعد متصل سلسلہ بیان کے لحاظ سے آیت نمبر ۱۵۰ کو پڑھا جائے۔ یہ آیت بطور جملہ معترضہ کے ہے اور قرآن مجید کا عام اسلوب بلاغت یہ ہے کہ واقعات کی تقسیم و تاخیر کا اعتبار کیے بغیر وہ نتائج اور عبرتوں کو درمیان کلام میں لے آتا ہے۔[122] مفسرین کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیہ کریمہ کی کوئی بھی توجیہ کی جائے، یہ بات سب کے نزدیک مسلمہ ہے کہ بنی اسرائیل کی ندامت حضرت موسیٰ علیہاالسلا کی واپسی کے بعد تھی، اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

۲۸۔ قیامت کے دن مجرموں کو نامہ اعمال کیسے دیا جائے گا؟

قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

وَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ وَرَآءَ ظَهۡرِهٖ [123]

رہا وہ شخص جسے اس کا نامہ اعمال پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ بِشِمَالِهٖ [124]

اور رہا وہ شخص کہ جسے اس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ اسے نامہ اعمال پشت کے پیچھے سے دیا جائے اور دوسری آیت میں فرمایا کہ مجرم کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ چنانچہ معترض کا خیال ہے کہ یہاں اس تناظر میں قرآن مجید کا بیان متناقض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔ نامہ اعمال بائیں ہاتھ کو پشت کے پیچھے کر کے بھی دیا جا سکتا ہے۔ علامہ زمخشری مجرم کو نامہ اعمال دینے کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قیل تغل یمناه الی عنقه و تجعل شماله وراء ظهره فیوتی کتابه بشماله من وراء ظهره [125]

ایک قول یہ ہے کہ اس کا دایاں ہاتھ گلے کا طوق بنا دیا جائے گا اور بایاں ہاتھ پشت کی طرف لے جا کر اس میں نامہ اعمال تھما دیا جائے گا۔

مجاہد کہتے ہیں:

یجعل شماله وراء ظهره فیاخذبها کتابه [126]

اس کا بایاں ہاتھ اس کی پشت کے پیچھے کیا جائے گا اور پھر اسے اس کا نامہ اعمال دیا جائے گا۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:

---

[121] امام ابراہیم بن عمر البقاعی، نظم الدرر، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ج۳، ص ۱۱۴

[122] مولانا عبدالماجد دریاآبادی، تفسیر ماجدی، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، ص ۳۵۸

[123] (الانشقاق:۱۰)

[124] (الحاقۃ:۲۵)

[125] الکشاف، ج۴، ص ۷۲۷

[126] تفسیر مظہری، ج۷، ص ۳۷۶

تغل یمناه الی عنقه و تجعل یسره وراء ظهره فیاخذ بهاکتابه [127]

اس کا دایاں ہاتھ گلے کا طوق بنادیا جائے گا اور اس کا بایاں ہاتھ اس کی پشت کے پیچھے کر دیا جائے گا۔ اس طرح وہ اپنا نامہ اعمال پکڑے گا۔

مفسرین کی ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے اور ان میں تطبیق کو عقل سلیم بھی بخوبی سمجھ سکتی ہے۔

۲۹۔ حضرت عیسیٰ علیہا السلا کی وفات ہوئی یا ان کی موت مشتبہ کر دی گئی؟

اس تناظر میں بھی قرآن مجید کی دو آیات سے حسب منشا استدلال کرتے ہوئے قرآن مجید میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا۔ پہلی آیت ہے:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ [128]

جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ! بے شک میں تمہیں مکمل طور پر لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ [129]

انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہا السلام کو قتل کیا اور نہ ہی سولی چڑھایا لیکن معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔

یہاں پہلی آیت سے مُتَوَفِّيْكَ سے عرفی معنی میں حضرت عیسیٰ علیہا السلا کی وفات ثابت کی اور پھر دعویٰ کیا کہ اس آیت سے ان کی موت ثابت ہوتی جبکہ دوسری آیت سے ان کی موت کا مشتبہ ہونا ثابت ہوتا ہے تو اس سے قرآن مجید کے بیان میں تضاد ثابت ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دعویٰ ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق حضرت عیسی علیہا السلام پر موت طاری نہیں ہوئی۔ جب یہودیوں نے انہیں پھانسی دینے کا منصوبہ بنایا تو ایک روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہا السلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جس پر میری شبیہ ڈال دی جائے اور میری جگہ پھانسی چڑھا دیا جائے اور شہادت کی موت پائے تو آپ کے ساتھیوں میں سے ایک نے اسے سعادت سمجھتے ہوئے قبول کیا اور یہودیوں نے اسے حضرت عیسیٰ علیہا السلام سمجھتے ہوئے پھانسی چڑھا دیا اور دوسرا قول یہ ہے کہ جس شخص نے آپ کی نشاندھی کی تھی اسی پر آپ کی شبیہ ڈال دی گئی اور انہوں نے اسے ہی عیسیٰ علیہا السلام سمجھتے ہوئے پھانسی چڑھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہا السلام کو آسمان پر اٹھالیا۔ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ [130]

اور یہ بات یقینی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہا السلا کو قتل نہیں کیا بلکہ انہیں اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا۔

اسی چیز کو ولکن شبہ لھم (النساء: ۱۵۷) سے تعبیر کیا گیا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہا السلا کو نہ قتل کیا نہ سولی چڑھایا لیکن معاملہ ان پر مشتبہ کر دیا گیا۔ اور دوسری آیت میں متوفیک کے الفاظ اس سے متصادم نہیں ہیں کیونکہ یہاں توفی سے مراد عام معنی میں موت نہیں ہے۔ موت تو ہر انسان کو آئے گی۔ اس میں بتانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ بتائی وہ بات جاتی ہے جس میں کوئی خبریت ہو۔ الوافی کا معنی ہے الذی بلغ التمام [131] وہ چیز جو اپنی تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس صورت میں متوفیک کا معنی ہے متم عمرك[132] میں تیری عمر پوری کرنے والا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ یہ یہودی آپ کو پھانسی نہیں دے سکیں گے اور آپ اپنی پوری عمر کو پہنچ کر انتقال کریں گے اور توفی کا دوسرا مفہوم ہے اخذ الشئی وافیا [133] کسی چیز کو پورا پورا لے لینا۔ اس صورت میں اس سے مراد یہ ہے کہ یہ تمہیں پھانسی نہیں دے سکیں گے، میں تمہیں مکمل طور پر آسمانوں پر اٹھالوں گا۔ اور توفی کا اصلی معنی کسی چیز کو مکمل طور پر لے لینا ہی ہوتا ہے اور اس کا معنی موت عرفی اور مجازی ہے تو

---

[127] تفسیر جلالین، ج۶، ص ۲۵۲

[128] (آل عمران:۵۵)

[129] (النساء:۱۵۷)

[130] (النساء:۱۵۸)

[131] امام الراغب الاصفہانی، مفردات الفاظ القران، دار الکاتب العربی،، ص ۵۶۵

[132] تفسیر کبیر، ج۸، ص ۷۱

[133] ایضاً، ج۸، ص ۷۲

یہاں اس سے مراد انہیں زندہ آسمانوں پر اٹھانا ہی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہاں کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور یہ عربی زبان کا معروف اسلوب ہے۔ اس صورت میں اس آیت سے مراد ہے:

انی رافعک الی ومطهرک من الذین کفروا و متوفیک بعد ان تنزل من السماء [134]

میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا اور کافروں کی تہمتوں سے پاک کرنے والا ہوں اور آپ کے آسمان سے اترنے کے بعد آپ پر موت طاری کرنے والا ہوں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں آیات حضرت عیسیٰ علیہا السلام کی حیات ہی ثابت کرتی ہیں اور ان میں تضاد کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

۳۰۔ موت دوبار ہے یا تین بار

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ [135]

تم اللہ تعالیٰ کا انکار کیسے کر سکتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے، اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر وہ تمہیں مارے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا اور پھر تم اس کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ [136]

اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندگی دی۔

ان آیات کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا کہ پہلی آیت سے دو زندگیاں اور تین بار موت ثابت ہے اور دوسری آیت سے دوبار موت اور دوبار زندگی ثابت ہے۔ اس سے قرآن مجید کے متن میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعویٰ بالکل بے حقیقت اور بہت ہی سطحی سی بات ہے۔ ان دونوں آیات میں ایک ہی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان آیات پر متعدد پہلوؤں سے طویل مباحث موجود ہیں لیکن ان دونوں آیات کا مدار ایک ہی حقیقت کو بیان کرتا ہے اور وہ قدرت باری تعالیٰ کا اظہار ہے۔ حضرت ابن مسعود، ابن عباس اور قتادیٰ کا قول یہ ہے کہ ان دونوں آیات میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر ہے۔ پہلی موت حالت عدم اور دوسری موت دنیوی زندگی کے بعد کی موت اور پہلی زندگی دنیا کی زندگی اور دوسری زندگی مرنے کے بعد کی زندگی یعنی خواہ وہ کسی بھی مرحلہ کی ہو۔ حضرت ابن مسعودؓ آیت کریمہ: رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ سے متعلق فرماتے ہیں:

هذه الآية كقوله تعالیٰ كيف تكفرون بالله و كنتم امواتا فاحياكم ثم يميتكم ثم يحيكم ثم اليه ترجعون و كذا قال ابن عباس والضحاک و قتاده و ابومالک وهذا هو الصواب الذی لا شک فيه ولامرية [137]

یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا انکار کیسے کرو گے کہ تم مردہ تھے، اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ حضرت ابن عباس، ضحاک، قتادہ اور ابومالک کا یہی قول ہے یہی درست ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

اگرچہ دو موتوں اور دو زندگیوں کی تعبیر مختلف بھی کی گئی ہے لیکن دونوں آیات میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ہی ذکر ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔ ان تمام مباحث سے یہ حقیقت بالکل واضح اور عیاں ہو جاتی ہے کہ ان تیس مقامات پر تضاد کا دعویٰ ایک بے حقیقت بات ہے۔ قرآن مجید ہر قسم کے تضاد سے بالکل محفوظ اور مبرا ہے۔ اب ان تمام مقامات کا خلاصہ ملاحظہ ہو تاکہ حقیقت سمجھنے میں مزید آسانی ہو۔

---

[134] ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری، تفسیر قرطبی، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ج۴، ص ۱۰۰

[135] (البقرہ:۲۸)

[136] (المؤمن:۱۱)

[137] تفسیر القرآن العظیم، ج۴، ص ۴۷

خلاصہ بحث

1. ان تمام مباحث کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات سے واضح ہے اور خلاصہ میں بھی مضمون والی ترتیب ہی ملحوظ خاطر رکھی گئی ہے: حضرت مریمؑ کو بشارت حضرت جبریل امینؑ نے ہی دی تھی لیکن چونکہ وہ فرشتوں کے سردار تھے اور سردار کی بات پوری قوم کی بات ہوتی ہے، اس لیے کبھی کہا گیا کہ فرشتے نے بشارت دی اور کبھی کہا گیا کہ فرشتوں نے بشارت دی۔ اس لیے سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۳۰ اور سورہ مریم کی آیت نمبر ۱۹ میں کوئی تضاد نہیں اور ممکن ہے کہ حضرت جبریلؑ امین کے ساتھ اور فرشتے بھی ہوں اور متکلم صرف حضرت جبریلؑ ہوں۔ تو متکلم کے اعتبار سے واحد اور سب کے اعتبار سے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہو۔ اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔
2. قوم ثمود کی تباہی اس طرح ہوئی کہ حضرت جبریل امینؑ نے کوخوفناک چیخ ماری جس سے زمین لرز اٹھی اور ان کے دل سینوں میں پھٹ گئے اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ تو چیخ کے اعتبار سے ان کی بربادی کا سبب الصیحۃ کو قرار دیا گیا اور زلزلہ کے اعتبار سے اسے الرجفۃ کہا گیا۔ چونکہ یہ عذاب حد سے بڑھا ہوا تھا، اس لیے اسے الطاغیۃ بھی کہا گیا۔ چونکہ یہ آواز فضا سے بلند ہوئی تھی اس لیے اسے الصاعقۃ بھی کہا گیا۔ اس لیے سورہ ھود: ۱۴، سورہ الاعراف:۷۸، سورہ الحاقہ :۵ اور سورہ حم السجدہ:۱۷ میں کوئی تضاد مطلقاً نہیں ہے۔
3. زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی اور اس کا دحو یعنی پھیلاؤ آسمان کی تخلیق کے بعد ہوا۔ لہٰذا سورۃ البقرہ کی ۲۹ اور سورۃ النازعات کی آیت ۳۰ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔
4. پہلے روزے رکھنے کا حکم اختیاری تھا کہ روزہ رکھو یا فدیہ دو۔ یا روزے کا حکم روزے کی استطاعت رکھنے والے کے لیے ہے اور فدیہ کا حکم شیخ فانی کے لیے یا فدیہ سے مراد صدقہ فطر ہے۔ اس لیے سورۃ البقرہ کی ۱۸۴، اور آیت ۱۸۵ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔
5. زمین و آسمان چھ دنوں میں ہی بنے: وقدر فیھا اقواتھا فی اربعہ ایام میں چار دنوں سے زمین اور اس کی روزی کے مجموعی چار دن ہیں اور دو دنوں میں آسمان بنا۔ یہ کل چھ دن ہوئے لہٰذا سورہ ھود کی آیت ۷ اور سورہ حم السجدہ کی آیات ۹ تا ۱۲ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔
6. بدکاری کی سزا پہلے انہیں گھروں میں بند کرنا تھا، پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور سزا دونوں کے لیے سو سو دڑّے مقرر ہوئی۔ اس لیے سورۃ النساء کی آیت ۱۵ اور سورۃ النور کی آیت ۲ میں کوئی تضاد نہیں واضح ہے۔ یہ غیر شادی شدہ کی سزا ہے اور شادی شدہ کی سزا رجم ہے۔
7. احکام میراث کے نزول سے پہلے فوت ہونے والے خاوند کو حکم تھا کہ وہ ممکنہ حد تک اپنے گھر والوں کو اپنی بیوی کے حق میں ایک سال کے لیے سکنی اور نان و نفقہ کی وصیت کر جائے اور متوفی عنھا زوجھا کی عدت چار مہینے دس دن ہی ہے۔ اس لیے سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۴ اور آیت ۲۴۰ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔
8. جہاد کا مقصد دین کے دشمنوں پر سختی کرنا ہے تا کہ ان کا وجود باقی لوگوں کے لیے فساد اور شر کا سبب نہ بنے اور یہ اخلاق عالیہ کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کی تربیت کرتے ہوئے اس پر سختی کرنا اخلاق حسنہ کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے سورہ عبس کی آیات ۲،۱ اور سورۃ القلم کی آیت ۴ اور سورہ محمد کی آیت ۴ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔
9. دین میں کوئی جبر نہیں اور جہاد کا مقصد کسی کو جبراً مسلمان کرنا نہیں بلکہ اسلامی ریاست کا غلبہ ہے۔ غیر مسلم افراد اسلامی ریاست کے غلبہ کو مان کر جس دین پر چاہیں رہیں۔ اس لیے سورۃ البقرہ کی آیت ۲۵۴ اور سورۃ التوبہ کی آیت ۲۹ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔
10. پہلے حکم تھا کہ سو مومنوں کو ہزار کافروں پر غالب آنا چاہیے۔ پھر مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے اس حکم میں نرمی کر دی گئی اور حکم دیا گیا کہ سو مومن دو سو کافروں پر غالب آئیں۔ اس لیے سورۃ الانفال کی آیت ۶۵ اور ۶۶ میں نسخ ہے، تضاد نہیں۔
11. غزوہ بدر میں پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتے بھیجنے کا وعدہ فرمایا پھر محض اپنے کرم سے اس تعداد کو تین ہزار کر دیا۔ پھر جب یہ افواہ پھیلی کہ کرز بن جابر ایک لشکر کے ساتھ قریش کی مدد کو آ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے چند شرائط کے ساتھ اس تعداد کو پانچ ہزار کر دیا۔ اس لیے سورۃ الانفال کی آیت ۹ اور سورہ آل عمران کی آیت ۱۲۴ اور ۱۲۵ میں ایک ترتیب کا بیان ہے، تضاد نہیں۔

12. ہر فعل کا خالق اور فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے لیکن اس دنیا میں ہر کام اسباب کے پردے میں ہوتا ہے۔ اس لیے جب ایک بندہ حق سے اعراض کرتا ہے تو شیطان اسے ورغلاتا ہے اور وہ شیطان کے اثر کو قبول کرتا ہے۔ اس لیے خالق ہونے کے ناطے گمراہی کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے اور کبھی گمراہی کا سبب ہونے کے ناطے شیطان کی طرف اور کبھی گمراہی کا اثر قبول کرنے کے سبب انسان کی طرف۔ اس لیے سورۃ القصص کی آیت ۱۵، سورہ ق کی آیت ۲۷ اور سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۹۷ میں کوئی تضاد نہیں۔

13. اگر بندہ بغیر توبہ کے مر جائے تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے کرم سے شرک کے سوا اس کے باقی گناہ معاف کر دے لیکن اللہ تعالیٰ شرک کو بغیر توبہ کے معاف نہیں کرتا۔ اس لیے سورۃ الزمر کی آیت ۵۳ اور سورۃ النساء کی آیت ۱۱۶ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

14. کوئی بندہ قرآن مجید میں تبدیلی نہیں کر سکتا البتہ اللہ تعالیٰ نے بعض احکامات کو خود منسوخ کر دیا۔ اس لیے سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۵ اور سورۃ البقرہ کی آیت ۱۰۶ میں کوئی تضاد نہیں۔

15. ابلیس جنّات میں سے تھا لیکن فرشتوں کے ساتھ عبادت کرتا تھا چونکہ جو حکم اعلیٰ کو دیا جائے، ادنیٰ اس میں بدرجہ اولیٰ شامل ہوتا ہے۔ اس لیے سجدہ کے حکم میں یہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ اس لیے سورۃ البقرہ کی آیت ۳۴ اور سورۃ الکہف کی آیت ۵۰ میں کوئی تضاد نہیں ہے

16. حضرت آدم علیٰ نبیّنا وعلیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ پھر انسان کی بقا کا سبب قطرہ آب کو بنایا گیا۔ اب انسان کی تخلیق قطرہ آب سے ہوتی ہے اور قطرہ آب خوراک سے بنتا ہے اور خوراک مٹی سے بنتی ہے تو قطرہ آب انسانی تخلیق کا سبب قریب اور مٹی سبب بعید ہے۔ اس لیے کہیں انسانی تخلیق کا سبب قطرہ آب کو قرار دیا گیا اور کہیں مٹی کو۔ اس لیے سورۃ الفرقان کی آیت ۵۴ اور سورۃ الانعام کی آیت ۲ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

17. شراب حرام بھی ہے اور نجس بھی لیکن سکر کو نعمتوں کے ساتھ یا تو اس لیے ذکر کیا گیا کہ اس وقت تک شراب حرام نہیں تھی لیکن وہاں بھی اسے رزق حسن کے مقابل ذکر کے یہ احساس دلا دیا گیا کہ شراب رزق حسن میں شامل نہیں۔ اور یا پھر اسے نعمتوں کے ساتھ اس لیے ذکر کیا گیا کہ سکر کا لفظ کسی میٹھے مشروب کے لیے ہے اور اس سے نبیذ بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اس لیے سورۃ المائدہ کی آیت ۹۰ اور سورۃ النحل کی آیت ۶۷ میں کوئی تضاد نہیں۔

18. ایک سے زائد بیویوں میں معاملات میں تو انصاف ممکن ہے لیکن محبت میں انصاف ممکن نہیں۔ چنانچہ انسان بیویوں میں معاملات میں تو انصاف کر سکتا ہے لیکن قلبی رجحان اور محبت میں نہیں۔ اس لیے سورۃ النساء کی آیت ۳ اور آیت ۱۲۹ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

19. قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کلامِ محبت صرف ایمان والوں سے کرے گا جو ان کے لیے بہت بڑا انعام ہو گا لیکن کافروں کی زجر و توبیخ کرے گا جو ایک عذاب ہو گا یا بلاواسطہ کلام صرف مومنوں سے فرمائے گا اور کافروں سے فرشتوں کے واسطہ سے کلام فرمائے گا۔ اس لیے سورہ آل عمران کی آیت ۷۷ اور سورۃ النحل کی آیات ۹۲۔۹۳ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

20. اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔ نعمت کا بھی اور مصیبت کا بھی۔ سرکش انسانوں پر مصیبتیں ان کے گناہوں کے سبب آتی ہیں۔ اس لیے مصیبتوں کی نسبت کبھی خالق ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے اور کبھی سبب ہونے کے ناطے انسانوں کی طرف۔ اس لیے سورۃ التغابن کی آیت ۱۱ اور سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

21. قرآن مجید ہدایت کا راستہ تمام انسانوں کو دکھاتا ہے لیکن اس ہدایت کو قبول صرف تقویٰ کے طالب ہی کرتے ہیں اور ہدایت کی ایک صورت راستہ دکھانا ہے جسے اراءۃ الطریق کہا جاتا ہے اور دوسری صورت منزل مقصود تک پہنچانا ہے جسے ایصال الی المطلوب کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید تمام لوگوں کے لیے اراءۃ الطریق والی ہدایت ہے اور ایمان والوں کے لیے ایصال الی المطلوب والی۔ اس لیے سورۃ البقرہ کی آیت ۲، اور آیت ۱۸۵ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

22. ضرت موسیٰؑ کی دعوت کے ابتدائی دنوں میں ان کی قوم کے چند نوجوان ہی آپ پر ایمان لائے تھے اور بعد میں بہت سے لوگ ایمان لائے اور جادوگر بھی۔ اس لیے سورہ یونس کی آیت ۸۳ اور سورہ الاعراف کی آیت ۱۱۹ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

23. اللہ تعالیٰ ہر فعل کا خالق حقیقی ہے۔ جب کوئی سر کش انسان حق سے اعراض کر کے شیطان کی طرف مائل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے شیطان کا دوست بنا دیتا ہے تو فاعل حقیقی ہونے کے ناطے شیطان کی لوگوں سے دوستی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے اور سبب ہونے کے ناطے انسان کی طرف۔ اسی لیے سورۃ الاعراف کی آیت ۲۷ اور آیت ۳۰ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

24. جب امیر لوگوں نے رسول کریمؐ سے سرگوشیاں کرتے ہوئے آپ کا بہت زیادہ وقت لینا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ رسول کریمؐ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دیا کرو۔ جب یہ حکم لوگوں پر شاق گزرا تو اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو اٹھالیا۔ اس لیے سورۃ المجادلۃ کی آیت ۱۲ اور ۱۳ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

25. زمین و آسمان بند تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زمین سے سبزہ اگا کر اور آسمان سے بارش برسا کر انہیں کھول دیا۔ یا پہلے وہ آپس میں پیوست تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں الگ الگ کر دیا۔ جہاں ان سے جو الگ الگ خطاب ہے، وہ الگ کرنے کے بعد ہے اور جہاں اکٹھا ذکر ہے وہ ان کے متصل ہونے کے وقت ہے۔ اس لیے سورہ حم السجدہ کی آیت گیارہ اور سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۰ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

26. اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی کا کوئی دوست یا مددگار نہیں۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کسی کو عذاب دینا چاہے تو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی کسی کا دوست یا مددگار نہیں لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہے تو کسی کے لیے بھی بطور انعام یا بطور عذاب اس کا کوئی دوست یا مددگار بنا دیتا ہے۔ اس لیے سورۃ العنکبوت کی آیت ۲۲ اور سورہ حم السجدہ کی آیت ۳۱ میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ فرشتوں کو ایمان والوں کے دوست اللہ تعالیٰ نے ہی بنایا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی دوستی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی ہی دوستی ہوتی ہے۔

27. بنی اسرائیل میں سے بچھڑے کی پوجا کرنے والے لوگ پہلے بچھڑے کی پوجا کرنے پر ڈٹ گئے تو پھر حضرت موسیٰؑ کے تشریف لانے کے بعد آپ کی زجر و توبیخ کے سبب اپنے اس فعل پر نادم ہوئے۔ اس لیے سورہ طٰہٰ کی آیت ۹۱ اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۹ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

28. قیامت کے دن مجرموں کو ان کا نامہ اعمال ان کا بایاں ہاتھ ان کی پشت کے پیچھے کر کے اس ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اس لیے سورۃ الانشقاق کی آیت دس اور سورۃ الحاقۃ کی آیت ۲۵ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

29. حضرت عیسیٰؑ کو یہودی نہ قتل کر سکے اور نہ ہی سولی چڑھا سکے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمانوں پر اٹھالیا اور متوفیک کا معنی بھی اسی مفہوم کو واضح کرتا ہے کیونکہ اس کا معنی یا تو یہ ہے کہ میں آپ کو آپ کی پوری عمر تک پہنچانے والا ہوں یا یہ کہ میں آپ کو مکمل طور پر اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ مقصود دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے کہ یہودیوں کے منصوبے ناکام ہوں گے۔ یہ آپ کو سولی نہیں چڑھا سکیں گے۔ میں آپ کو زندہ آسمانوں پر اٹھالوں گا۔ آپ وقت مقررہ پر واپس زمین پر جاؤ گے اور عمر پوری کر کے آپ کا وصال ہو گا۔ اس لیے سورۃ آل عمران کی آیت ۵۵ اور سورۃ النساء کی ۱۵۷ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

30. دوبار ہی موت ہے اور دوبار ہی حیات، پہلی موت حالت عدم اور دوسری دنیوی زندگی کے بعد۔ پہلی حیات دنیوی اور دوسری اخروی۔ برزخی حیات اخروی حیات کے ہی تابع ہے۔ اس لیے سورۃ البقرہ کی آیت ۲۸ اور سورۃ المؤمن کی آیت گیارہ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔